بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

گزشتہ چند مہینوں میں کئی اہم اور گراں قدر علمی شخصیتیں اس دنیا سے رحلت اختیار کرگئی ہیں، جنھوں نے علم ومعرفت کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں، اوراپنی کرنوں سے ایک جہان کو منور کر رہی تھیں، آج کے اس دور میں جو کہ قحط الرجال کا دور ہے، اور دین کا ٹھوس اور پختہ علم رکھنے والے دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں، دین ومذہب کی سچی تڑپ اور فکر رکھنے والے ناپید ہوتے جارہے ہیں، ان شخصیتوں کا اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ اور اندوہناک حادثہ ہے، جس کی وجہ سے علمی مجالس کا سونا پن بڑھتا جارہا ہے۔اس وقت ماضی قریب میں وفات پانے والی متعدد علمی ہستیوں کا نام ذہن میں ہے، جن میں سے ہر ایک پر مستقل مضمون لکھنے کا جی بھی چاہتا تھا، اور ارادہ بھی تھا، لیکن اپنی عدیم الفرصتی اور شدید ترین مصروفیتوں کی وجہ سے یہ ارادہ روبہ عمل نہ آسکا، اس لیے ''حرف آغاز'' میں ان کا تذکرہ کرکے اس کوتاہی کی تلافی کی کوشش کی جارہی ہے۔

پہلا حادثہ مشہور عالم دین اور بزرگ علمی شخصیت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کا ہے، جن کا سانحہ ارتحال ۳۰؍نومبر ۲۰۱۲ء کو جمعہ کے دن پیش آیا۔مولانا مرحوم، مئوضلع کے ایک مقام رگھولی کے رہنے والے تھے، اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے جاں نثار شاگردوں میں تھے۔امروہہ، گورینی اور گورکھپور وغیرہ کے متعدد مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے چکے تھے، اور بڑی تعداد میں طالبان علوم دینیہ ان سے فیض یاب ہوئے تھے، جن میں بہت سے ایسے ہیں جن کے توسط سے مولانا مرحوم کا علمی فیضان جاری ہے، صاحب قلم بھی تھے، اور آپ کی تحریر برجستہ اور شگفتہ ہوتی تھی، تکلف اور تصنع کا آپ کی تحریروں پر اثر نہیں ہوتا تھا، گورینی سے شائع ہونے والا رسالہ ''ریاض الجنہ'' اور گورکھپور سے آپ کا جاری کیا ہوا ''دانشور'' آپ

کے مضامین سے مشک بار رہوا کرتا تھا۔

علم دین کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم ذاکر وشاغل اور عامل بھی تھے، اور بہت سے پریشان حال لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ کے علاج سے شفایاب بھی ہوجایا کرتے تھے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز رہی ہوگی۔

....

۲۴ رمحرم ۱۴۳۴ھ مطابق ۹ ردسمبر ۲۰۱۲ء کو گجرات کی ایک معروف اور مقتدر علمی شخصیت مولانا عبدالرحیم متالا صاحب بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ مولانا مرحوم جامعہ حسینیہ راندیر (سورت) کے فارغ التحصیل اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ کے دست گرفتہ وفیض یافتہ تھے۔ بعد میں انھوں نے افریقہ کے شہر زامبیا میں بساط درس بچھائی، اور وہاں معہد الرشید کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کرکے درس وافادہ میں مشغول ہوگئے، جس کے ذریعے آپ کا فیض دور دراز تک پہنچا۔ اور بہت بڑی تعداد میں علماء وطلبہ آپ کے علم ومعرفت سے بہرہ مند ہوئے۔

مولانا مرحوم صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ علم دوست، معارف پرور، علم دین اور دین ومذہب کے مخلص خادم تھے، ان کو اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف اور ان کی اشاعت سے خصوصی دلچسپی تھی، انھوں نے حضرت شیخ الحدیث صاحب کے صحیح بخاری کے درسی افادات کو قلم بند کرکے حرز جان بنائے رکھا تھا، جو مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مرادآبادی کے زیر نگرانی ''سراج القاری'' کے نام سے شائع ہورہے ہیں، اس کی کئی جلدیں طبع ہوکر اشاعت پذیر ہوچکی ہیں، جو درحقیقت ایک بڑی علمی خدمت ہے، اس کام میں محنت کرنے والوں میں ہمارے شہر کے ایک فاضل نوجوان مولانا خورشید احمد قاسمی بھی ہیں، خدا سے دعا ہے کہ اس کار خیر میں حصہ لینے والے تمام افراد کی خدمتوں کو قبول فرماکر اس کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

....

۱۷ رربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۳۰ رجنوری ۲۰۱۳ء کو دن کے تقریباً ۱۱ بجے مولانا عبداللہ حسنی ندوی کا انتقال ہوا، مولانا مرحوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کے خانوادے کے چشم وچراغ تھے، مولانا ڈاکٹر عبدالعلی ندوی کے اکلوتے صاحبزادے مولانا محمد حسنی علیہ الرحمہ تھے، جو اپنے

وقت کے مایۂ ناز ادیب وصاحب قلم اور سرگرم داعئ اسلام تھے۔ مولانا عبداللہ حسنی ان ہی مولانا محمد حسنی کے فرزند ارجمند تھے، اور اپنی دینی واسلامی روایات کے پاسبان وامین تھے۔ علم وعمل کے پیکر اور نیک صالح انسان تھے، مزاج میں سادگی اور طبیعت میں متانت اور سنجیدگی تھی، رابطۂ ادب اسلامی کے بعض سیمیناروں اور بعض دوسرے مواقع پر ان کی زیارت وملاقات سے شرف یاب ہونے کا موقع ملا ہے، اور ان کی سادگی اور ملنساری سے دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ ندوۃ العلماء کے استاذ تھے اور سالہا سال سے درس وتدریس کی اہم خدمت انجام دے رہے تھے، علاوہ بریں دعوت وتبلیغ ان کا اہم مشغلہ تھا، انھوں نے دعوت وتبلیغ اسلام کے ایک ایسے میدان کو اپنی توجہ کا مرکز اور حیات مستعار کا مشن بنا رکھا تھا، جس سے عام طور پر صرف نظر کرلیا گیا ہے، اس وقت غیر مسلموں میں اسلام کی پیغام رسانی کی اہم خدمت انجام دے رہے تھے، جو انشاء اللہ ان میزان عمل میں بہت باوزن ثابت ہوگی۔

....

ان سب بزرگوں کے بعد ہمارے لیے سب سے بڑا علمی سانحہ ہمارے مخدوم بزرگ حضرت مولانا زین العابدین معروفی کی وفات کا ہے، جو ۲۸/اپریل ۲۰۱۳ء کو دنیوی زندگی کے ۸۰/سال سے زیادہ کا سفر طے کر کے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کا وجود اس دور میں بسا غنیمت تھا، ان کی زندگی علم ودین کی خدمت سے عبارت تھی، درس وتدریس اور خدمت علم ودین مولانا کی کتاب زندگی کا سب سے روشن باب تھا، جس کے علاوہ ان کو کسی اور چیز سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے بہترین فاضل اور فارغ التحصیل، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے خرمن علم کے خوشہ چینیوں میں تھے۔ فراغت کے بعد سے تادم آخر درس وتدریس کا کام انجام دیتے رہے، اور ہندوستان کے مختلف اہم اداروں کی مجلس درس کو رونق بخشتے رہے۔ احیاء العلوم مبارک پور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مظہر العلوم بنارس، دارالعلوم چھاپی گجرات، سبیل السلام حیدرآباد میں آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ آخر میں مظاہر علوم سہارنپور میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ قائم ہوا تو اس کے منصب صدارت کے لیے وہاں کے ارباب انتظام کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی، اور ۱۸/سال تک نہایت انہماک اور دل جمعی کے ساتھ حدیث شریف کی گراں قدر خدمت انجام دیتے رہے، اس اثنا میں بڑی تعداد میں تشنگان علم ومعرفت آپ کے سرچشمۂ

علمی سے سیراب ہوکر اپنی علمی تشنگی بجھاتے رہے۔

مولانا مرحوم بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے، سادگی، شرافت، سادہ لوحی آپ کے خاص اوصاف تھے، صبر وشکر اور قضاء الٰہی پر راضی برضا رہنا آپ کا امتیازی وصف تھا، ذہین اور قوی الحافظہ تھے، علمی گہرائی وگیرائی کے ساتھ دقت نظر بھی بدرجۂ اتم تھی۔

درس وتدریس کے ملکہ کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ بہت سی تصانیف انھوں نے یادگار چھوڑی ہیں، آپ کی بیش قیمت تصانیف میں ''المرتضی کا علمی احتساب'' مشہور فارسی کتاب ''تذکرۂ علماء ہند'' مصنفہ رحمان علی کا اردو ترجمہ، اور مولانا محمد طاہر پٹنی کی ''المغنی'' پر تعلیقات وحواشی راقم کی نظر سے گزرے ہیں اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ مظاہر علوم کے ماہنامہ میں ان کے مستقل مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے، گزشتہ کچھ عرصہ سے امام بخاری کی عظیم الشان تصنیف ''الأدب المفرد'' کے مضامین کا ترجمہ وتشریح ان کے قلم سے شائع ہو رہا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے، یا ترجمہ کا کام جاری تھا۔

مولانا اپنے شاگردوں اور خوردوں پر بہت شفیق اور مہربان رہتے تھے، اس راقم کو آپ سے شرف تلمذ تو نہ حاصل ہو سکا، لیکن آپ کی خوردنوازی اور شفقت ومہربانی سے ہمیشہ متمتع ہوتا رہا ہے۔

مولانا مرحوم کی وفات علمی دنیا کا ایک بہت بڑا خسارہ ہے، خدا سے دعا ہے کہ ان کے انتقال سے واقع ہونے والے خلا کو پُر فرمائے اور مولانا کو نیز دیگر تمام مرحومین کو آغوش رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کی علمی ودینی خدمات کو شرف قبول سے بہرہ ور فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا کی شخصیت اور زندگی کے اہم گوشوں پر مستقل مضمون جو مدیر تحریر حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کے سلیس اور رواں دواں قلم سے ہے، اس شمارے میں شامل اشاعت ہے، جس سے مولانا مرحوم کے اخلاق وکردار اور فضل وکمال کے متعدد پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

تفسیر سورۂ عبس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعض مفسرین کا تسامح:

بعض ظاہر بین مفسرین کو موت کے نعمت ہونے سے غفلت ہوئی، اس لیے انھوں نے یہاں سوال کیا ہے کہ نعمتوں کی گنتی میں موت کو کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ پھر اس کا اس طرح جواب دیا ہے کہ بلغاء کے کلام کا مدار اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کا مقام اس کلام کا آخر ہوا کرتا ہے، لہذا یہاں پر موت کے بعد قبر میں ڈالنے کے حکم کو ذکر فرمایا ہے اور قبر میں ڈالنا دراصل یہ نعمت ہے (اور یہ نعمت موت کے بعد حاصل ہوتی ہے اس لیے موت کو نعمتوں کے شمار میں ذکر کر دیا) اگر چہ موت فی نفسہ نعمت نہ ہو، جیسا کہ کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے سے اپنی نعمتیں بیان کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تیرے ساتھ ایسا ایسا سلوک کیا پھر تو بیمار ہوا تو تیرا علاج کرایا، یہاں حقیقت میں مقصود نعمت علاج ہے، لیکن اس کا نعمت ہونا بیمار ہونے پر موقوف ہے اس لیے کلام میں بیماری کا ذکر کرنا پڑا۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ہے، اور اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے (یعنی اصل مقصود نعمت اقبار ہے) اماتت اور اقبار کے درمیان ''ثم'' نہیں لائے ''فاء'' لائے ہیں چنانچہ فرمایا:

فَاَقْبَرَهٗ ○

پھر قبر میں رکھوا دیا اس کو

گویا ارشاد فرماتے ہیں کہ اماتت واقبار کا مجموعہ نعمتوں میں داخل ہے نہ کہ فرداً فرداً ہر ایک نعمت ہے۔

فائدہ:- یہاں پر یہ بھی جان لینا چاہئے کہ قبر میں ڈلوانے کو اِقبار کہتے ہیں اور ڈالنے کو قبر کہتے ہیں، کہا جاتا ہے ''أقبر الرجل عبده إذا حكم بان يقبر'' یعنی ''أقبر الرجل عبده'' اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی اپنے غلام کی میت کو دفنانے کا حکم دے، ''وقبر الرجل عبده إذا أدخله فی القبر'' اور ''قبر الرجل عبده'' اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی غلام کی میت کو قبر میں داخل کرے۔

مُردوں کو دفنانے کی ابتداء:

مردے کو دفنانے کے لیے اللہ تعالی کے حکم کی صورت، اول بار اس طرح واقع ہوئی کہ جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تھا تو دنیا میں انسان کے مرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا، اس لیے اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس مردے کا کیا کرے؟ اس لیے وہ اس لاش کو ایک چادر میں باندھ کر اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا، جب اس لاش کو لیے ہوئے پھرتے پھرتے تنگ آ گیا تو ایک جنگل میں غمگین ہو کر بیٹھ گیا، اچانک دو کوے وہاں آ گئے اور آپس میں لڑنے لگے یہاں تک کہ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر مارنے والے نے اپنے پنجوں اور چونچ کے ذریعہ سے ریت کے اندر ایک گڑھا بنایا اور مرے ہوئے کوے کو اس میں ڈال کر اس کے اوپر خوب ریت ڈال دی کہ ایک تودہ سا بن گیا۔

اب قابیل کے سمجھ میں بات آئی کہ مردے کو اسی طرح دفن کرنا چاہئے، چنانچہ اس نے بھی اسی طرح بھائی کی لاش کو دفن کر دیا اور قبر بنا دی۔

پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نے وفات پائی تو آسمان سے فرشتے اترے، انھوں نے ان کی اولاد کے سامنے ان کی تجہیز و تکفین کی اور ان کو قبر میں دفن کیا، اسی روز سے یہ طریقہ معمول بن گیا، یہ تعلیم الہی پہلی بار قابیل کو اس کی استعداد کے قصور کی وجہ سے کوے کے ذریعے دی گئی، اور دوسری بار حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو فرشتوں کے ذریعے تعلیم دی گئی۔

مُردے کو قبر میں دفنانے کی خوبیاں اور جلانے کی برائیاں:

مردے کو قبر میں دفنانا، اللہ تعالی کی اپنے بندوں پر بہت بڑی نعمت ہے ورنہ لوگ لاش کو جانوروں کی طرح گھسیٹ کر پھینک دیا کرتے، وہ ادھر ادھر لڑھکتی پھرتی، جب گل سڑ جاتی تو لوگ اس کی بدبو سے تنگ آتے اور بدگوئیاں کرتے۔ درندے، پرندے اس کے اعضاء کے جوڑ جوڑ کو گلی کوچے میں لئے پھرتے، الغرض وہ مردار خور اور ناپاک جانوروں کی خوراک بن جاتی، اور ہر ایک کے سامنے اس کے عیب ظاہر ہوتے جس سے لوگوں کی نظر میں مرنے والے کی عزت و توقیر جاتی رہتی، اس میں انسانیت کی نہایت ہی توہین تھی، اللہ تعالی نے انسان کی عزت و تکریم کے لیے غیب سے یہ تعلیم عطا فرمائی۔

اب ہم آتے ہیں اس بات کی طرف کہ ہندو مردے کو جلاتے ہیں دفناتے نہیں اور کہتے ہیں کہ آگ ہر ناپاک کو پاک کرنے والی، ہر بدبو کو مٹانے والی ہے، سو جو سڑانا چاہتے ہیں، وہ دفن کرتے

ہیں لیکن آگ میں جلانا بہتر ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ آگ خائن ہے جو چیز اس کے حوالے کرو وہ اس کو کھا جاتی ہے، اور زمین امانت دار ہے جو چیز اس میں دفن کی جاتی ہے وہ باقی رہتی ہے، لہذا مردے کو خائن کے سپرد کرنے سے بہتر ہے زمین کے اندر رکھا جائے، اسی لئے انسانوں بلکہ جانوروں تک کی یہ عادت ہے کہ جس چیز کو محفوظ رکھنا چاہیں اس کو زمین میں دفن کر دیتے ہیں جیسے مال، خزانہ وغیرہ، اور جس چیز کو نیست و نابود کرنا چاہیں اس کو آگ میں جھونک دیتے ہیں۔

دفنانے کے افضل ہونے کی دوسری وجہ:

انسانوں کو دوبارہ اٹھنے اور ارواح کا اپنے چھوڑے ہوئے اجسام میں واپس آنے کا انتظار ہے، مردے کو جلا دینا یہ اس انتظار کے خلاف ہے (اگر چہ حقیقت میں اس سے دوبارہ اٹھنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی لیکن ظاہراً یہ طریقہ اس کے خلاف ہے گویا اب یہ مردہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا)

تیسری وجہ:

اس میں مردے کی انتہائی بے قدری و بے حرمتی ہے کہ اپنے ہاتھوں اس کو جلا کر اس کی خاک کو ہوا میں اُڑا دیں، ایسا معاملہ تو ناکارہ و ناپاک چیزوں سے کرتے ہیں اگر کوئی عمدہ پاکیزہ چیز ہو اور اس کو باقی رکھنا منظور ہو تو زمین میں دفن کرنے کا معمول ہی چلا آیا ہے۔

چوتھی وجہ:

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آگ بدبو دور کرتی اور زمین سڑانڈ پیدا کرتی ہے، یہ بات اس وقت قابل لحاظ ہو سکتی ہے جب اس چیز کو زمین سے نکالنا مقصود ہو، جب اس کو وہیں باقی رکھنا ہے تو سڑانڈ وغیرہ سے کیا فرق پڑے گا، اس کا اثر باہر تھوڑا ہی آتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو دیکھیں کہ قبر میں رطوبتیں گل سڑ کر خشک ہو جاتی ہیں، ہاتھ، پیر، جوڑ (ڈھانچہ) اپنی شکل وصورت پر باقی رہتا ہے، گویا جس طرح اپنی زندگی میں وہ سوتا تھا اب بھی وہ سو رہا ہے، اس کے مقابلے میں آگ کے اندر جلانے سے جسم کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

پانچویں وجہ:

انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے لہذا ''کل شئ يرجع إلى أصله'' کے قاعدے کے

مطابق انسان کو اپنی اصل کی طرف لوٹانا چاہئے (اور وہ مٹی ہے) جب کہ آگ جنات وشیاطین کی پیدائش کا مادہ ہے، (اس کی طرف انسانوں کو لوٹانا خلاف اصل ہے) پھر جب موت کے بعد انسانوں کے بدن کو جلاتے ہیں تو روح جو لطیف شئ ہے، آگ کے دھوئیں سے مل کر جنات وشیاطین کے ساتھ کامل مشابہت اختیار کر لیتی ہے، اسی وجہ سے اکثر ان لوگوں کی روحیں جن کو جلا دیا جاتا ہے شیاطین کے حکم میں ہو جاتی ہیں، انسانوں سے چمٹتی، اور ایذا دیتی پھرتی ہیں، لہذا مردے کو دفن کرنا شئ کو اپنی حقیقت کی طرف لوٹانا ہے، اور جلانا اس کے خلاف ہے۔

ایک دانشمند ہندو کا واقعہ:

حکایت ہے کہ اسلام کا ایک لشکر سیستان کے علاقے کی طرف آیا تو ایک ہندو جو عقلمند تھا، وہ اسلام کی چال ڈھال اور طرز وطریقہ دیکھنے کے لیے گیا کہ اسلام اس وقت ایک نیا مذہب تھا، چنانچہ وہ اسلامی طرز وطریقہ اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہنے لگا، تمھاری سب چیزیں اچھی ہیں سوائے ایک چیز کے (پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے؟ تو اس نے کہا) کہ تم لوگ مردے کو دفن کرتے ہو اور آگ میں جلاتے نہیں ہو، حالانکہ دفنانا سڑانڈ وناپاکی کا سبب ہے جب کہ آگ میں جلانا بدبو اور تعفن کو مٹا دیتا ہے۔ اتفاق سے وہاں فقہائے اسلام میں سے ایک فقیہ موجود تھے، انھوں نے اس ہندو سے کہا میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، پہلے تم اس کا جواب دو پھر میں تمھارے اعتراض کا جواب دوں گا، اس نے کہا پوچھئے، فقیہ نے فرمایا کہ بھلا ایک آدمی اگر کسی ملک میں سفر کر کے جائے، وہاں وہ ایک عورت سے نکاح کرے اور ایک دوسری عورت کو کھانے پکانے کے لیے خادمہ رکھے، پھر اس منکوحہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہو، اب اتفاق سے اس کو کہیں دوسرا سفر درپیش آجائے تو بتایئے کہ وہ بچہ ماں کے حوالے کرنا چاہئے یا پکانے والی خادمہ کے سپرد کرنا چاہئے، اس پر ہندو نے کہا کہ ماں کے ہوتے ہوئے بچہ پکانے والی کے حوالے نہیں کرنا چاہئے، تب فقیہ اسلام نے فرمایا تم نے خوب بات کہی اب اپنے اعتراض کا جواب سنو!

روحِ آسمانی جب دنیا کے گھر میں آئی تو بدن زمین سے بنا کر اس کو دیا گیا، پھر ہمیشہ زمین سے اس کے لئے غذا، دوا، لباس اور طرح طرح کے فائدے پہنچائے گئے، اور آگ سوائے پکانے جلانے کے آدمی کے کسی فائدے کے لیے نہیں، آگ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ ہے کہ زمین سے کچی

جو چیزیں اگیں ان کو وہ پکا دیتی ہے لہٰذا زمین آدمی کی ماں ہوئی اور آگ باورچن، اب جب روح نے جو باپ کی مانند ہے عالمِ برزخ کی طرف سفر کرنا چاہا تو بدن جو اس کے بیٹے کی مانند ہے اس کو ماں کے حوالے کیا جانا چاہئے نہ کہ پکانے والی باورچن کے حوالے کیا جائے، ہندو یہ سن کر قائل ہو گیا۔

نیز یہ بھی ہے کہ آگ بدن کو پراگندہ کر دیتی ہے جس کی وجہ سے روح کا تعلق بدن سے ختم ہو جاتا ہے، اس عالم (بدن کے عالم) کے آثار روح کو کم پہنچتے ہیں، اور روح کی کیفیات بھی ادھر کم سرایت کرتی ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں دفن کرنے کی صورت میں چونکہ بدن کے تمام اجزاء اپنے مقام پر برقرار رہتے ہیں تو روح کا تعلق ان کے ساتھ از راہِ نظر وعنایت بحال رہتا ہے، اور زیارت کے لیے آنے والے حضرات کی طرف روح کی توجہ آسان ہوتی ہے، اس لیے کہ بدن کی جگہ متعین ہونے کی وجہ سے گویا روح کی جگہ بھی معین ہوگئی۔ چنانچہ اس عالم کے آثار جیسے صدقہ، خیرات، تلاوت قرآن وغیرہ جو بدن کے مدفن پر ہوتے ہیں وہ آسانی سے فائدہ بخش ہوتے ہیں۔

لہٰذا جلا دینا گویا روح کو بے مکان کر دینا ہے اور دفن کرنا گویا روح کو ٹھکانا دینا ہے، اسی وجہ سے جو اولیاء اللہ، صلحاء، مومنین دفن کئے گئے ہیں ان سے فائدہ متصور اور فیض لینا جاری ہے، بخالف جلائے ہوئے مردوں کے کہ یہ چیزیں ان کے مذہب والوں کے نزدیک بھی ان سے متصور نہیں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دفن کرنے کا طریقہ انسانوں کے حق میں ایک بہت بڑی نعمت ہے، اگر بعض لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں جیسے اور بہت ساری نعمتوں کی کرتے ہیں تو کوئی شکوہ نہیں کہ انسان کی جبلت میں ناشکری ہے۔ پھر اس نعمت پر اکتفا نہیں بلکہ فرمایا:

ثُمَّ اِذَا شَاءَ اَنْشَرَهٗ ○

پھر جب چاہا اٹھا نکالا اس کو

یعنی پھر جب چاہے گا زندہ کر کے قبر سے باہر نکال لائے گا، تاکہ انسان عالم آخرت میں اپنے اعمال کا بدلہ چکھے اور ہمیشہ کی زندگی پائے، اگرچہ یہ نعمت (دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا) وقوع میں نہیں آئی کہ اس کو نعمہائے معلومہ وملفوظہ کی تعداد میں شمار کیا جائے، لیکن عاقل شخص ذرا خیال کرے تو اس کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس وقت موجودہ جو نعمتیں ملی ہیں جب ان میں سے کسی نے مشیت کی مخالفت نہیں کی (جب اللہ کی مشیت ہوئی وہ نعمتیں وجود میں آ گئیں ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے کسی نعمت کو

عطا کرنا چاہا ہو اور وہ عطا نہ ہوئی ہو) تو دوبارہ اٹھنا، جینا اللہ کی مشیت سے یہ بھی (یقیناً) ہو جائے گا، اللہ کی مشیت کے خلاف نہیں ہوگا، اسی لئے اس نعمت کو یہاں اللہ کی مشیت کے ساتھ (خاص طور پر) معلق فرمایا ہے، اس کے علاوہ آدمی کی اول پیدائش یہ خود دلیل صریح اور برہان واضح ہے اس بات پر کہ دوبارہ پیدائش (میں کچھ شبہ نہیں) لہٰذا اگر کوئی اس نعمت کا انکار کرے تو اس کی نادانی وحماقت ہی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ:

یہاں اس شبہہ کا اندیشہ تھا کہ کہیں انسان یہ نہ سمجھنے لگ جائے کہ مجھے پیدائش سے ہی فضیلت سے نوازا گیا ہے، پھر میرا مرنا جینا بھی دوسری مخلوقات سے الگ اور ممتاز ہے، لہٰذا آخرت میں بھی مجھے ضرور نوازا ہی جائے گا، اس لیے کہ ''نواختہ را نباید انداخت وعزیز کردۂ خود را ذلیل نباید ساخت'' اور نیز دوسری بار جب روح ڈالی جائے گی تو اس وقت بھی انسان ہی ہوں گا، اور انسانیت تو بہرحال تعظیم واکرام کا سبب ہے، اس گمان کو دفع کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

كَلَّا

ہرگز نہیں

یعنی ہرگز ایسا گمان نہیں کرنا چاہئے، اس لیے کہ پہلی بار کا اکرام تو اس وجہ سے تھا کہ ابھی گناہوں کا صدور نہیں ہوا تھا، اور گناہوں کے سرزد ہو جانے کے بعد پھر جب دوبارہ اس کو اٹھایا جائے گا تو اگرچہ انسان ہی ہوگا مگر اب گنہگار انسان ہوگا، لہٰذا اس اعادے کو پہلی حالت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، کرم سابق کی وجہ سے کرم لاحق کا امیدوار نہیں ہونا چاہئے، اور انسان کس طرح کرم لاحق کا امیدوار ہو کر پھول سکتا ہے جب کہ اس کا یہ حال ہے کہ:

لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ

پورا نہ کیا جو اُس کو فرمایا

یعنی ابھی تک اس نے وہ بات انجام نہیں دی جو بات اس کے خالق، اس کو عزت بخشنے والے نے فرمائی تھی، اگر اس کے فرمان کو بجالاتا، بندگی سے عہدہ برآ ہوتا پھر تو عزت واکرام کی توقع بجا تھی لیکن تقصیر ونافرمانی کی صورت میں ڈر اور خوف رکھنا چاہئے، بلکہ ذلت وخواری کی توقع ہونا چاہئے، اور یہ جو کہتے ہیں کہ ''نواختہ را نباید انداخت'' واقع کے خلاف ہے بلکہ بہت سی چیزیں ہیں جو اکرام کے

بعد سزا پاتی اوران کی تذلیل وتحقیر کی جاتی ہے اگراس بات میں کچھ شک ہوتو:

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ

اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو

یعنی انسان کواپنی خوراک کی طرف دیکھنا چاہئے کہ کس طرح ناپاک فضلہ بن جاتی ہے حالانکہ نہایت احترام، صفائی واحتیاط کے ساتھ پکائی گئی تھی، اوراللہ کی عنایات جس خوراک کے پیدا کرنے اور پالنے میں کارفرما تھیں وہی انسان کے پیدا کرنے میں مصروف تھیں، چنانچہ اس بات میں اچھی طرح غور کرے کہ:

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا

کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گزرتا ہوا پھر چیراز مین کو پھاڑ کر

یعنی پھر ہم نے زمین کو چیر کر پھاڑا جس طرح پھاڑنے کا حق ہے جو کہ بچے کی پیدائش کے وقت بچہ دانی کے کھلنے سے بہت زیادہ ہے، اور یہ عنایات تو اس ضعیف گھاس پر تھیں جو زمین کے اندر سے نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔

فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا ۝

پھر اگایا اس میں اناج

یعنی پھر ہم نے اس زمین سے دانے اگائے جیسے گیہوں، چنے وغیرہ، جو قوت بخش ہیں۔

وَّعِنَبًا

اور انگور

یعنی انگور پیدا کیے جو طاقت وقوت بھی دیتے ہیں اور میوے کا میوہ ہیں، شراب بھی ان سے بنتی ہے۔

وَّقَضۡبًا ۝

اور ترکاری

یعنی جڑیں پیدا کیں جو کھائی جاتی ہیں جیسے شلجم، گاجر، چقندر اور شکرقند وغیرہ جو کھانے میں نہایت قوت بخش ہیں، پھر اگر کچی کھائی جائیں تو حرارت وتشنگی دور کرتی ہیں، پکایا جائے تو بہترین سالن اور اگر مربہ بناؤ تو لذیذ میوہ ہے۔

وَّزَيۡتُوۡنًا

اور زیتون

یعنی زیتون کو پیدا کیا، جو تیل بھی ہے سالن بھی۔

وَّنَخۡلًا ۝

اور کھجوریں

یعنی کھجور پیدا کی، جو قوتِ غذائیت بھی رکھتی ہے، میوہ بھی ہے، سالن بھی، سرکہ بھی ہے، نبیذ بھی۔

وَّحَدَآئِقَ

اور گھن کے

یعنی باغات پیدا کیے جن کے چار دیواری ہوتی ہے، ان کے اندر طرح طرح کے پھل دار درخت اور جڑی بوٹیاں اگائی جاتی ہیں۔

غُلۡبًا ۝

باغ

(وہ باغات) گھنے درختوں والے ہیں جن کی ٹہنیاں موٹی موٹی ہوتی ہیں۔

غلب کی لغوی تحقیق:

لغت عرب میں غلب اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس کی گردن پر بہت بال ہوتے ہیں، یہاں استعارے کے طور پر اس باغ کو غلب کہا گیا ہے جس کے درخت گنجان اور ڈالیں موٹی ہوں۔

وَّفَاكِهَةً

اور میوہ

یعنی وہ میوے پیدا کئے جو باغوں میں نہیں ہوتے، صحرائی یا کوہستانی ہیں۔

وَّاَبًّا ۝

اور گھاس

یعنی خودرو گھاس پیدا کی جس کو کوئی بوتا نہیں خود بخود اگتی رہتی ہے۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؁

کام چلانے کوتمھارے اورتمھارے چوپایوں کے

یعنی تمھارے اورتمھارے چوپایوں کے فائدے کے لیے یہ سب کچھ پیدا کیا۔

جواشیاء ذکر کی گئی ان میں سے بعض خاص طور پر جانوروں کے لیے ہیں، جیسے گھاس۔ بعض مشترک ہیں، انسانوں اور جانوروں دونوں کے استعمال میں آتی ہیں، جیسے اناج دانے وغیرہ، اور بعض وہ ہیں کہ ان کی اصل اور اچھی چیز تو انسان کھاتے ہیں اور ان کی بھوسی، چھلکے، گٹھلیاں اور پتے وغیرہ جانور کھاتے ہیں، پھر کھالینے کے بعد یہی غذاء کس قدر ذلیل وحقیر ہوجاتی ہے کہ نجاست وگوبر بن جاتی ہے، گھروں سے اس کو دور پھینک دیا جاتا ہے، اس کی بدبو سے لوگ نفرت کرتے ہیں، اب ذرا غور کرلیا جائے اس سابقہ عزت اورانجام کی اس ذلت کے بارے میں (کہ عزت کے بعد ذلت ہوئی کہ نہیں)

اورانسان اس دھوکے میں نہ پڑے کہ دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے، اس لیے کہ آدمی کی خوراک عزت کے بعد جھٹ پٹ ہی ذلیل کردی جاتی ہے، یعنی کھانے کے بعد غلاظت بن کر نکلتی ہے، جب کہ آدمی کی عزت تو ایک مدتِ دراز کے بعد ذلت سے بدلی جائے گی، لہٰذا دونوں میں بہت فرق ہے، اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہئے، اس لیے کہ اس مدت کی ایک حد معین ہے، غیر محدود نہیں اور وہ یہ ہے:

فَاِذَا جَاءَ تِ الصَّاخَّةُ ؁

پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی

یعنی جب وہ چیخ آئے گی جو سب کے کان بہرے کردے گی، اس سے صور پھونکنے کی طرف اشارہ ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيْهِ ؁

جس دن کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے

یعنی اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، حالانکہ دنیا میں اس کو دوسروں سے زیادہ عزیز رکھتا اس سے مشورہ کرتا، اس کی تائید و مدد کرتا اور بچپن سے اس کے ساتھ مانوس تھا۔

وَ اُمِّهٖ

اور اپنی ماں سے

یعنی اپنی ماں سے بھی بھاگے گا جب کہ ماں کو تو بھائی سے بھی زیادہ چاہتا تھا اور ماں کے حق بھی بہت ہیں۔

وَ اَبِیۡهِ ۝

اور اپنے باپ سے

یعنی اپنے باپ سے بھاگے گا حالانکہ اس کی تعظیم ماں سے بھی زیادہ کرتا تھا، اور حقوق بھی اس کے بہت ہیں بلکہ گویا بیٹا اسی کا ہے۔

وَ صَاحِبَتِهٖ

اور اپنی ساتھ والی سے

یعنی اپنی بیوی سے بھاگے گا جب کہ اس کے ساتھ سب سے زیادہ پیار کرتا تھا، اس لیے کہ تا حیات اس کی رفاقت اس کے ساتھ تھی، ماں باپ کے بارے میں تو یہ سمجھتا ہے کہ خواب و خیال تھا جو گذر گیا اب ان سے کچھ واسطہ نہیں رہا۔

وَ بَنِیۡهِ ۝

اور اپنے بیٹوں سے

یعنی اپنے بیٹوں سے بھاگے گا، جب کہ بیٹے بیوی سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کو مرنے کے بعد اپنا قائم مقام سمجھتا ہے۔

ان قرابتوں کے ذکر کرنے میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ترتیب رکھی ہے، چنانچہ ظاہر ہے جو اتنے قریبی رشتہ داروں سے بھاگے گا تو دور کے لوگوں سے تو بدرجۂ اولیٰ بھاگے گا۔

الازہارالمربوعہ

باب دوم

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

[حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ گراں قدر رسالہ المآثر کے متعدد شماروں میں سلسلہ وار شائع ہوا ہے، اس رسالہ کے دو حصے تھے، ایک حصہ حضرت کی زندگی میں طبع ہوا تھا، اور دوسرا تشنۂ طبع تھا، المآثر میں پہلے حصے کی اشاعت جلد ۲۱ شمارہ ۳ پر پوری ہو چکی تھی، دوسرے حصے کا مسودہ مفقود ہے، لیکن کبھی اس کی فوٹو کاپی کرائی گئی تھی، تلاش کرنے پر وہ بھی نہیں مل رہی تھی، اللہ کے فضل وکرم سے اب وہ فوٹو کاپی دستیاب ہوگئی ہے، جس کی مدد سے اس جلد کو بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ لیکن فوٹو ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں ناصاف ہے اور اس کا پڑھنا مشکل ہے، اس طرح کی جگہوں پر نقطے لگا دیئے جائیں گے۔ ادارہ]

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد!

یہ رسالہ الازہار المربوعہ کا حصہ دوم ہے، پہلے حصہ میں احناف کے دلائل پر صاحب آثار کی بحثوں کے کافی وشافی جوابات آپ پڑھ چکے، اب مخالفین کے دلائل کو قوی ثابت کرنے کی جو ناکام کوشش جناب مجیب (صاحب آثار) نے کی ہے، اس کی حقیقت ملاحظہ فرمایئے۔

میں نے اعلام کے باب دوم میں اُن حدیثوں پر بحث کی ہے جن کو اہل حدیث اپنے استدلال میں ذکر کرتے ہیں، چنانچہ ایک مختصر تمہید کے بعد میں نے اعلام کے باب دوم میں لکھا ہے:

(پہلی حدیث) مسلم شریف کے حوالہ سے نقل کی جاتی ہے، اس حدیث کا پورا مضمون یہ ہے کہ ابوالصہباء نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عہد نبوی اور عہد فاروقی کے ابتدا میں تین طلاق ایک تھی، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہاں! لیکن جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کی تو حضرت عمرؓ نے تینوں کو نافذ کر دیا۔

ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حدیث صرف حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے منقول

ہے، صحابہ میں اور کوئی صحابی اس حدیث کو روایت نہیں کرتا، اور ابن عباسؓ سے اس حدیث کو طاؤس روایت کرتے ہیں اور طاؤس سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عبداللہ سے اس حدیث کو متعدد اشخاص روایت کرتے ہیں، جن میں سے معمر، ابن جریج، اور ابراہیم بن میسرہ ہیں۔ امام مسلم نے سب سے پہلے اس حدیث کو معمر کے طریق سے روایت کیا ہے، اس کے بعد ابن جریج اور ابن میسرہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ حاصل یہ کہ حدیث ایک ہی ہے؛ ہاں ابن طاؤس کے نیچے اس کے تین طریقے مسلم میں ہیں اور ان تینوں طریقوں میں اصل حدیث کا مضمون متحد ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ابن جریج اور ابن میسرہ کے طریقوں میں ذکر حدیث کا سبب بھی مذکور ہے اور معمر کے طریق میں نہیں ہے۔

اس کے بعد سنئے کہ مجیب صاحب نے آثار متبوعہ کے باب اول میں اول صحیح مسلم سے یہ حدیث بطریق معمر نقل کی ہے اور دعوی کیا ہے کہ بنارس والے فتوے میں یہی حدیث منقول ہے اور اس کے علاوہ مسلم میں دو حدیثیں اور بطریق ابن جریج اور ابراہیم بن میسرہ مروی ہیں اور میری نسبت یہ لکھا ہے کہ مؤلف (اعلام) نے ابن جریج اور ابن میسرہ کی حدیثوں کے معنی کو لکھا ہے۔ لیکن یہ سب مجیب صاحب کی غلط بیانیاں ہیں، اولاً تو صحیح مسلم میں اس مسئلہ کے متعلق تین حدیثیں مذکور نہیں ہیں، بلکہ صرف ایک حدیث مذکور ہے، ہاں اس حدیث کے تین طریق ہیں۔ اگر مجیب صاحب کی یہی مراد ہے تو یہ مراد ان کی عبارت سے ظاہر نہیں ہوتی، اس لیے کہ ''وہ دو حدیثیں اور بطریق ابن جریج اور ابن میسرہ'' لکھتے ہیں، حالانکہ مذکورہ بالا مراد ہوتی تو لکھتے کہ یہی حدیث بطریق ابن جریج و ابن میسرہ بھی مروی ہے۔

ثانیاً:- جب مسلم میں ایک ہی حدیث مذکور ہے تو یہ لکھنا بنارسی فتوے میں فلاں حدیث منقول ہے اور مؤلف اعلام نے فلاں دو حدیثوں کا معنی لکھا ہے؛ غلط ہے، حق یہ ہے کہ جو حدیث بنارسی فتوے میں ہے وہی میں نے بھی لکھی ہے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں اس مسئلہ کے متعلق کوئی دوسری حدیث موجود ہی نہیں ہے۔

ثالثاً:- میری نسبت یہ دعوی کرنا کہ مؤلف اعلام نے ابن جریج اور ابن میسرہ کی حدیثوں کا معنی لکھا ہے اور انہیں کو اہل حدیث کا استدلال قرار دے کر بحث کی ہے اس لیے غلط ہے کہ میں نے حدیث ابن عباس کے ہر سہ طریق مندرجۂ صحیح مسلم کا خلاصۂ مضمون لکھا ہے، کسی خاص طریق کو نہیں لیا

ہے، اور اگر بالفرض میں نے کسی خاص طریق کو لیا ہوتا تب بھی یہ کہنا غلط ہی ہوتا کہ جس حدیث کو مفتی نے اپنے فتوے میں درج نہیں کیا اس کو پیش کر کے رد وقدح کرتے ہیں (آثار ص۱۳) اس لیے کہ حدیث تو وہی ہوتی، ہاں طریق بدلا ہوا ہوتا۔

رابعاً: - اگر بالفرض میں نے اس حدیث کو دوسرے طریق سے نقل کیا تو اس میں کیا قباحت ہے۔ کیا میرے نقل کیے ہوئے طریق میں حدیث کا مطلب دوسرا ہے اور مفتی بنارس کے طریق کا دوسرا؟ یا میں نے کسی ایسے راوی پر جرح کر دی ہے جو مفتی کے طریق میں نہیں ہے؟ اگر یہ کوئی بات نہیں تو اس تطویل لا طائل سے کیا حاصل۔ افسوس ہے کہ عقل سے کام نہیں لیتے صرف اعتراض کرنا جانتے ہیں۔

اس کے بعد مجیب صاحب نے حدیث مسلم کو جملہ عیوب سے سالم و پاک ثابت کرنے کے لیے امام مسلم کی ایک عبارت نقل کی ہے، اس کی حقیقت آگے منکشف ہوگی............ میں نے حدیث مسلم کا مضمون لکھنے کے بعد اعلام میں لکھا تھا ''جواب اس کا یہ ہے کہ یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے، اولاً اس لیے کہ یہ روایت وہم وغلط ہے، چنانچہ بڑے جلیل القدر حافظ ومحدث ابن عبدالبر نے فرمایا ہے: **هذه الرواية وهم وغلط** یعنی یہ روایت وہم وغلط ہے (الجوہر النقی ص۱۱۳)''

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''یہ اعتراض بچند وجوہ صحیح نہیں اولاً اس لیے کہ کسی محدث کا محض یہ کہہ دینا کہ یہ روایت وہم وغلط ہے ہرگز قابل سماعت نہیں اور جو وجہ حافظ صاحب کے پورے مقولہ سے سمجھی جاتی ہے وہ نا قابل التفات اور محض غلط ہے''

جواب: - مجیب صاحب کا مذکورہ بالا جواب ان کی غیر مقلدیت کے لحاظ سے خلاف توقع نہیں، لیکن اصول حدیث اور عمل کے لحاظ سے غلط ضرور ہے، عمل کے خلاف تو اس لیے ہے کہ مجیب صاحب چاہیں گے تو متعدد مثالیں پیش کر دی جائیں گی جن سے ظاہر ہوگا کہ متعدد حدیثوں کو علمائے اہل حدیث نے کسی محدث کے وہم یا معلول کہہ دینے سے رد کر دیا ہے، اور اصول حدیث کے خلاف اس لیے کہ اصول حدیث میں اجلہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ حدیث کی مختفی علتوں کے بیان میں حجت اور وجہ نہیں پوچھی جا سکتی، بلکہ ماہرین فن پر اعتماد کر کے جو علت وہ بیان کریں گے اس کو مان لیا

جائے گا، چنانچہ تدریب الراوی ص ۸۹ میں مذکور ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی سے کسی نے کہا کہ آپ کسی حدیث کو کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور کسی کو کہتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں ہے تو آخر آپ یہ کس سے سن کر کہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ تم روپیہ پرکھنے والے کے پاس جاتے ہو اور وہ کہتا ہے کہ یہ روپیہ کھرا ہے اور یہ کھوٹا ہے تو کیا اس سے پوچھتے ہو کہ تم نے یہ کس سے معلوم کیا یا اس کی بات تسلیم کر لیتے ہو؟ اس نے کہا تسلیم کر لیتے ہیں، تو عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا کہ یہ فن بھی ایسا ہی ہے، اور انھیں کا یہ قول بھی ہے کہ حدیث کی علتوں کی معرفت الہام ہے، اگر تم علت بیان کرنے والے محدث سے پوچھو کہ آپ یہ کہاں سے کہتے ہیں تو وہ کوئی حجت و وجہ بیان نہیں کر سکتا۔ باقی مجیب صاحب نے حافظ ابن عبدالبر کے پورے مقولہ سے جو وجہ ذکر کی ہے، اور اس کو غلط کہا ہے اس کی حقیقت آگے منکشف ہوگی۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''ثانیاً حافظ ابن عبدالبر اس میں متفرد ہیں کسی ناقد فن سے اس کی تائید ثابت نہیں ہے الخ''

جواب:- اولاً مجیب صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کہاں کا اصول ہے کہ صرف ایک محدث نے کسی حدیث کو وہم کہا ہو تو بوجہ تفرد کے اس کا قول مقبول نہیں ہوگا۔

ثانیاً:- امام احمد، البیہقی اور ابن العربی کے کلام سے ابن عبدالبر کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ دو اول الذکر بزرگوں نے اس حدیث کو شاذ کہا ہے اور ابن العربی نے اس حدیث کی صحت میں کلام بتایا ہے، لہذا مجیب صاحب کا یہ کہنا کہ کسی ناقد فن سے اس کی تائید ثابت نہیں، صریح غلط بیانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجیب صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک دوسرا کوئی محدث بھی وہم کا لفظ نہ بولے تب تک تائید نہیں ہوگی، اگر ایسا ہے تو یہ مجیب صاحب کی خوش فہمی ہے، اسی طرح مجیب صاحب کا یہ فرمانا بھی غلط بیانی سے خالی نہیں ہے کہ جن لوگوں کا مسلک اس حدیث کے خلاف ہے وہ بھی اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں، ہاں اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے اس کو منسوخ کہتے ہیں یا اور کوئی تاویل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ سب مخالفین ایسا نہیں کرتے بلکہ بعض لوگ اس کی صحت میں کلام کرتے ہیں، جیسا کہ اعلام ص ۱۶ میں ابن العربی، امام احمد، اور بیہقی کا قول مذکور ہے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''ثالثاً امام مسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ صحیح مسلم میں میں نے انھیں حدیثوں کو جمع کیا ہے جن کی

صحت پر میرے علم میں اجماع ہے (دیکھو مسلم ص ۱۷۴)''

جواب:- مجیب صاحب نے یہاں پر جس دیانت کا مظاہرہ کیا ہے وہ محل صد تعجب ہے! اپنے مطلب کی حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لیے آج امام مسلم کے اس قول کو پیش کرنے میں وہ کوئی شرم محسوس نہیں کرتے، جس کو ان کے تمام اکابر واصاغر نے سر پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہے، جملہ ناظرین عموماً اور حضرات اہل حدیث کو خصوصاً غور سے سننا چاہئے کہ امام کا یہ قول صحیح مسلم میں وہاں پر مذکور ہے جہاں انھوں نے حدیث **إذا قرأ فأنصتوا** (یعنی امام جس وقت قرأت کرے تو تم چپ رہو) ذکر کی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنی چاہئے، لیکن چونکہ یہ حدیث مذہب اہل حدیث کے خلاف ہے اس لیے امام مسلم کے اس قول کو کہ ''میں نے صحیح مسلم میں انہیں حدیثوں کو جمع کیا ہے جن کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے'' پس پشت ڈال کر **إذا قرأ فأنصتوا** کو ہر ممکن صورت سے ضعیف ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور جب حدیث طلاق آتی ہے تو امام مسلم کے اسی قول کو اچھالا جاتا ہے اور انہیں کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ افسوس افسوس! کسی کو اس بیان میں کچھ شبہہ ہو تو مولانا بشیر الدین صاحب قنوجی کی العجب العجاب اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری کی تحقیق الکلام میں دیکھ لے کہ حدیث و**إذا قرأ فأنصتوا** کو کیسی کیسی زبردستیوں سے ضعیف بنایا گیا ہے اور امام مسلم کے مذکورہ بالا قول کو کوئی وقعت نہیں دی گئی ہے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالحی صاحب ظفر الامانی میں فرماتے ہیں کہ مشرق سے مغرب تک تمام دنیا کے محدثین نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی صحت پر اتفاق کیا ہے۔''

جواب:- مجیب صاحب کی یہ افترا پردازی حد درجہ افسوس ناک ہے، مولانا نے یہ نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ محدثین نے مشرق ومغرب میں اتفاق کیا ہے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی نظیر نہیں ہے، چنانچہ مولانا کی عبارت جس کو مجیب صاحب نے نقل کیا ہے یہ ہے: **و کتاباهما اصح الکتب بعد کتاب اللّٰه . هذا مما اتفق علیه المحدثون شرقا و غرباً ان صحیح البخاری و صحیح مسلم لا نظیر لهما فی الکتب** اس عبارت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ امام بخاری ومسلم دونوں کی کتابیں

کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں سے زیادہ صحیح ہیں، یہ بات ان باتوں میں سے ہے جن پر محدثین نے مشرق ومغرب میں اتفاق کیا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی نظیر کتابوں میں نہیں ہے۔ ہر صاحب بصیرت دیکھ سکتا ہے کہ مولانا نے ان کتابوں کے بےنظیر ہونے پر محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے نہ ان کی صحت پر۔ اوراس سے پہلے فقرے میں انھوں نے ان دونوں کو دوسری انسانی کتابوں سے زیادہ صحیح مانا، اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ان کتابوں کی ساری حدیثیں صحیح ہوں، اس لیے کہ اگر دوسری کتابوں کی دس بیس حدیثیں کمزور ہوں اور بخاری اور مسلم کی پانچ سات کمزور ہوں جب بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ بخاری ومسلم سب سے زیادہ صحیح ہیں۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

> ''مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب شارح ترمذی مقدمہ الطیب الشذی میں فرماتے ہیں کہ...... بخاری ومسلم کی بابت تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ ان میں جتنی مرفوع متصل حدیثیں ہیں وہ قطعا بلا ریب صحیح ہیں اور یہ کہ یہ دونوں اپنے مصنفین تک تواتر کا درجہ حاصل کرچکی ہیں اور یہ کہ جو شخص ان دونوں کتابوں کی احادیث کی صحت کی بابت منھ آئے گا اوران کی توہین کرے گا وہ بدعتی اور غیر مسلموں کی راہ کا متبع ہے۔''

جواب: — یہاں بھی مجیب صاحب غلط بیانی وافترا پردازی سے نہیں چوکے۔ کوئی صاحبِ علم مقدمہ الطیب الشذی ص ۳۰ کو سامنے رکھ کر بتائے کہ جس فقرے پر میں نے خط کھینچ دیا ہے وہ الطیب الشذی کے کس فقرے کا ترجمہ ہوسکتا ہے، نیز اس کو بھی دیکھئے کہ متبع غیر سبیل المؤمنین کا ترجمہ ''غیر مسلموں کی راہ کا متبع'' کتنا ''صحیح ترجمہ'' ہے؟

اس کے بعد مجیب صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اس مقام پر جو عبارت الطیب الشذی سے نقل کی ہے اوراپنی اعلی قابلیت کی بدولت اس کو مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کا قول سمجھا ہے، وہ درحقیقت حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب جس طرح احناف کے شیخ الشیوخ ہیں اسی طرح اہل حدیث جماعت کے استاذ الاساتذہ بھی ہیں، پس اگر اس عبارت کا وہی مطلب ہے تو مجیب صاحب کے اکابر (مولانا بشیر الدین، مولانا شمس الحق، مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا محمد علی ابوالمکارم صاحبان) کو بھی چاہیئے تھا کہ اپنے استاذ الاساتذہ کے فتوے کے بموجب بہت جلد توبہ کرڈالتے اس لیے کہ یہ حضرات صحیح مسلم کی حدیث اذا قرأ

فانصتوا وغیرہ کی صحت کی بابت منھ آئے ہیں، کیا مجیب صاحب بتا سکتے ہیں کہ ان حضرات نے کب توبہ کی تھی اور اگر نہیں کی تھی تو ان کی نسبت کیا ارشاد ہے۔

اصل یہ ہے کہ مجیب صاحب ہر بات بے سمجھے بوجھے لکھ جاتے ہیں۔مقدمہ الطیب الشذی کی عبارت کا یہی حال ہے کہ آپ نے اس کو نقل تو کر دیا لیکن سمجھنے کی کوشش نہیں کی، آپ نے یہ خیال کیا کہ بخاری ومسلم کی ہر حدیث کی نسبت یہ حکم لگایا جارہا ہے، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے حضرت شاہ صاحب نے یہ بات بخاری ومسلم کی ان حدیثوں کی بابت لکھی ہے جن پر کسی محدث نے کلام نہیں کیا ہے، نہ وہ منسوخ ہیں، نہ کسی دوسری حدیث اصح کے معارض ہیں، یا صحت سے مراد صحت اسنادی فقط ہے، اس لیے کہ اگر یہ مراد نہ ہو تو حضرت شاہ صاحب کا کلام صحیح نہ رہے گا۔اہل علم جانتے ہیں کہ امام دارقطنی نے صحیحین کی بہت سی حدیثوں پر کلام کیا ہے۔ابن حزم، ابن قیم اور دیگر محدثین نے بھی صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی بہتیری احادیث پر کلام کیا ہے، پس یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ ان میں جتنی مرفوع متصل حدیثیں ہیں وہ قطعاً بلا ریب صحیح ہیں''۔ ہاں اگر متکلم فیہ ومنسوخ ومعارض حدیثوں کو چھوڑ کر یہ کہا جائے تو صحیح ہوسکتا ہے، پس شاصاحب کے کلام کی یہی مراد متعین ہے، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شارح مسلم نے اس عبارت پر جو کچھ لکھا ہے اس سے میری تائید ہوتی ہے ملاحظہ ہو مقدمہ شرح مسلم۔

اس کے بعد مجیب صاحب نے صحیحین کی حدیثوں پر دارقطنی کے کلام کرنے کا جواب دیا ہے کہ ''امام بخاری ومسلم کو صحیح حدیث میں ان کے اغیار پر فوقیت حاصل ہے پس کسی ناقد کا قول ان کے مقابل میں کوئی وقعت نہیں رکھتا''۔

اس کی نسبت یہ گذارش ہے کہ حدیث إذا قرأ فأنصتوا کی بحث میں آپ کے اکابر اس اصول کو کیوں بھول گئے؟ اور کیوں امام مسلم کی صریح تصحیح کے مقابل میں دارقطنی وغیرہ کی تضعیف کو وقعت دی؟ کیا مذہبی تعصب کے سوا اور کوئی وجہ بھی اس کی ہوسکتی ہے؟ نیز یہاں راجح ومرجوح کا سوال نہیں ہے، یہاں تو یہ گفتگو ہے کہ تمام محدثین کا اتفاق جملہ احادیث صحیح مسلم کی صحت پر ہے یا نہیں۔آپ مانتے ہیں کہ ہے اور ہم کہتے ہیں ہرگز نہیں، اس لیے کہ دارقطنی نے بہتیری حدیثوں پر کلام کیا ہے، لہذا تمام کا اتفاق نہ ہوا، اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ رہا اس کو الشاذ کالمعدوم کہنا تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر آپ کو یہی جواب ہماری طرف سے اجماع صحابہ کی بحث میں دیا جائے تو آپ

کیا کریں گے؟ یعنی یوں کہا جائے کہ کسی صحابی سے ایقاع ثلث کے خلاف کوئی فتویٰ منقول نہیں ہے اور اگر ایک دوصحابی سے منقول ہوتو اولاً اس کا ثبوت بہ سند صحیح نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ شاذ ہے **والشـــــاذ کـــالمعدوم**. ہاں آپ کا **الشـــاذ کـــالمعدوم** والے جواب کو بطریق مؤلف اعلام کہنا صریح افترا پردازی ہے، آخر اس مشق دروغ بیانی سے آپ کا کیا منشا ہے میں نے کہاں پر یہ جواب دیا ہے؟

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''مؤلف نے ابن عبدالبر کی پوری عبارت نقل نہیں کی......اس کی وجہ یہ ہے کہ پوری عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عبدالبر نے اس روایت کو وہم وغلط اس لیے فرمایا کہ اس پر کسی عالم نے عمل نہیں کیا ......اور مؤلف جانتے ہیں کہ یہ قطعاً غلط ہے بلکہ عہد نبوی سے آج تک ہر قرن ہر زمانے میں اس پر عمل ہوتا چلا آیا ہے...... پھر اس پوری عبارت کو نقل کر کے اپنی اور ابن عبدالبر کی غلطی کو کس طرح طشت از بام کرتے (**هذا حاصل ما اطال به من غير طائل**)۔''

جواب:- مجھ کو سخت حیرت ہے کہ مجیب صاحب اپنی بے بضاعتی کے باوجود اکابر علماء کے منھ آنے کی جرأت کس طرح کر جاتے ہیں! یعنی آپ بھی ابن عبدالبر کی غلطی پکڑنے کے قابل ہو گئے؟ حالانکہ ان کی عبارت کے ایک معمولی لفظ کا ترجمہ بھی آپ کو نہیں آتا، علمائے عربیت شناس خاص طور پر توجہ فرمائیں کہ مجیب صاحب **إن هـذه الرواية وهم وغلط لم يعرج عليها أحد من العلماء** کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ یہ روایت وہم وغلط ہے۔ اس پر علماء میں سے کسی نے عمل نہیں کیا یعنی **لـم يعرج** کا ترجمہ عمل نہیں کیا۔ پھر فرماتے ہیں، قربان جایئے اس قابلیت کے، پھر اس قابلیت کے ساتھ ذرا آپ کی دیانت پر بھی ایک غلط انداز نظر ڈال لیجئے، فرماتے ہیں ''عہد نبوی سے آج تک ہر قرن ہر زمانے میں اس پر عمل ہوتا چلا آیا ہے'' میرا چیلنج ہے اگر مجیب صاحب کو اپنی دیانت وصداقت کا کچھ بھی پاس ہوتا تو عہد نبوی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے صرف ایک ایک عالم کا نام پیش کریں۔ اچھا یہ ناممکن ہو تو ہر صدی ہی کے ایک ایک عالم کا نام لیں، اور اگر یہ بھی نہ کر سکیں تو اپنی غلط بیانی کا اعتراف کریں۔

اس کے بعد مجیب صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر چہ آپ نے ابن عبدالبر کے دوسرے جملہ کو بمنزلہ سبب ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، جس کا جواب دینے کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں تھی جب تک اس کا ثبوت نہ دیتے، تاہم اگر اس کو بمنزلہ سبب کے مان بھی لیا جائے تو اس میں کوئی

خرابی نہیں اور آپ کا اس کو غلط قرار دینا محض آپ کی خوش فہمی ہے، آپ علماء کے محاورے سے واقف نہیں ہیں ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ ایسے مقامات میں علماء سے وہ علمائے مشہورین مراد ہوتے ہیں جن کے مذاہب کا اتباع مسلمانوں میں ہوتا آیا ہے، خصوصاً ابن عبدالبر کی کتاب الاستذکار کا تو نام ہی اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ علمائے مذاہب مشہورہ کے مذاہب کے بیان پر مشتمل ہے اور مؤطا کی شرح کے ساتھ اس کا بھی خاص طور پر اہتمام ہے، شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کتاب کا پورا نام **الاستذکار بمذاهب علماء الامصار فيما تضمنه المؤطا من معانی الراوی والآثار** ہے۔

علاوہ بریں ابن عبدالبر نے **لم يعرج عليها** الخ کہا ہے، جس کی مراد یہ ہے کہ کسی عالم نے اس سے استدلال وتمسک نہیں کیا ہے، اگر مجیب صاحب اس کو غلط سمجھتے ہوں تو ابن عبدالبر سے پہلے کسی عالم کا نام پیش کریں جس نے اس حدیث سے استدلال کیا ہو۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ صرف اتنا ذکر کرنا کافی نہیں ہوسکتا کہ فلاں فلاں عالم ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے کے قائل ہیں، بلکہ اس کے ساتھ اس کا ثبوت بھی دینا ہوگا کہ ان عالموں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے اور اگر اس کو ثابت نہ کرسکیں تو ابن عبدالبر کی تغلیط ناممکن ہے۔

مجیب صاحب کو یہ بھی یادرکھنا چاہئے کہ وہ اور ان کے ہم خیال حضرات اب جس جس صحابی یا امام یا عالم کو چاہیں اپنا ہم خیال ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کریں، لیکن ابن عبدالبر کے زمانے تک ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک کہنا کسی مستند عالم سے منقول ومشہور نہ تھا، چنانچہ علامہ ابوالولید باجی جن کی کتاب المنتقی سے آپ نے استناد کیا ہے اور ابھی ان کا قول بڑے دھوم دھام سے نقل کریں گے وہی علامہ باجی اسی کتاب المنتقی میں فرماتے ہیں: **إذا ثبت ذلک فمن أوقع الطلاق الثلاث بلفظة واحدة لزمه ما أوقعه من الثلاث وبه قال جماعة الفقهاء وحكى القاضی أبومحمد فی اشرافه عن بعض المبتدعة يلزمه طلقة واحدة وعن بعض اهل الظاهر لا يلزمه شئ وانما يروى هذا عن الحجاج بن أرطاة ومحمد بن اسحاق والدليل على ما نقوله إجماع الصحابة لان هذا مروی عن ابن عمر وعمران بن حصين وعبدالله بن مسعود وابن عباس وأبی هريرة وعائشة رضی الله عنهم ولا مخالف لهم** یعنی جب یہ ثابت ہو چکا تو جو شخص تین طلاق ایک لفظ میں دیدے تو اس کو تین طلاقیں لازم ہو جائیں گی اور اسی کی قائل فقہاء کی جماعت ہے اور قاضی ابومحمد نے اشراف

میں بعض بدعتیوں سے نقل کیا ہے کہ اس کو ایک طلاق لازم ہوگی اور بعض ظاہریوں سے نقل کیا ہے کہ اس کو کچھ لازم نہ آئے گا اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ قول حجاج وابن اسحاق سے روایت کیا جاتا ہے اور جو ہم لوگ کہتے ہیں اس کی دلیل صحابہ کا اجماع ہے اس لیے کہ یہ (ہمارا قول) ابن عمر اور عمران بن حصین اور ابن مسعود اور ابن عباس اور ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور ان کا کوئی مخالف نہیں ہے۔

قاضی ابوالولید اور ابن عبد البر تقریباً ہم عصر ہیں اور ابن عبد البر نے ابوالولید سے حدیث بھی روایت کی ہے (دیکھو تذکرہ) قاضی ابوالولید کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے تک ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک کہنا کسی مستند وصاحب سنت عالم کے مسلک کی حیثیت سے معروف نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۵۷ کا بقیہ

میرا آبائی وطن بھیرہ مولانا کے وطن پورہ معروف سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، بھیرہ میں مکتب کی تعلیم کے ساتھ درجہ حفظ کا بھی انتظام ہے، بہت سے حفاظ وہاں سے فارغ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک کسی کی دستار بندی نہیں ہوئی تھی گاؤں والوں نے منصوبہ بنایا کہ ایک بڑا جلسہ کیا جائے اور فارغ طلبہ کی دستار بندی کی جائے، شوال ۱۴۳۳ھ کی کوئی تاریخ طے ہوئی، حضرات علماء کرام کی دعوت کی ذمہ داری اس بندہ پر لوگوں نے ڈالی، دارالعلوم کے جلیل القدر مہتمم حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب سے تاریخ کی منظوری لی گئی، ان کے علاوہ میں نے دوسرے علماء کرام کے ساتھ حضرت مولانا زین العابدین صاحب سے بھی درخواست کی، آپ نے بہت خوشی سے آنا منظور کیا، تشریف لائے بڑی فاضلانہ تقریر فرمائی، اور مجھ سے تعلق کا خصوصی ذکر فرمایا، اہل انتظام نے مولانا کو کرایہ کی رقم دینی چاہی تو مولانا نے اپنے اس شاگرد کا نام لے کر فرمایا، میں ان کے حکم پر بہت خوش ہو کر آیا ہوں، میں کرایہ نہیں لوں گا اور باوجود اصرار کے نہیں لیا۔

مولانا واقعی نمونہ سلف بزرگ تھے، بے نفسی، سادگی، اخلاص وللّٰہیت، میں بے نظیر تھے، عالم ربانی، صاحب نسبت شیخ طریقت تھے، بعد والوں کے لئے نمونہ علم وعمل تھے، اللہ ان کے درجات بلند فرمائیں۔

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(تیسری قسط)

حق برزبان جاری

الحمدللہ کہ سید العلماء نے علی الرغم تسلیم کرلیا کہ حضرت علی کی امامت نہ منصوص من اللہ تھی نہ حضرت علی کا یہ دعویٰ تھا، اسی طرح دوسرے اختلافات جوشیعہ حضرات ان کے اور خلفاء ثلٰثہ کے مابین بتاتے ہیں وہ بھی کسی نص الٰہی کی بناء پر نہ تھے، اور امامت علی اور دوسرے مسائل اختلافیہ کا تعلق نوعی واجتماعی مفاد سے بھی نہ تھا، اس حق گوئی کے صلہ میں ہم سید العلماء کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اہلسنت کوخوشخبری سناتے ہیں کہ ؂

للہ الحمد میانِ من واو صلح فتاد   حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنے عمیق رنج اور انتہائی آزردگی بلکہ نفرت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ سید العلماء نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ ان کے الفاظ سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان ساری باتوں کا تعلق شخصی مفاد سے تھا، امامت کی خواہش ہو یا فدک کا مطالبہ یا دوسرے امور یہ سب نفسانی جذبہ اور ذاتی اغراض ومقاصد کے ماتحت تھے (استغفر اللہ) اہلسنت کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دامنِ عزت ان تمام آلائشوں سے بالکل پاک وصاف ہے، اور کوئی سنی اس توہین کو برداشت نہیں کرسکتا۔

سطور منقولہَ بالا سے شیعہ حضرات کے دعویٰ محبت اہلبیت کی حقیقت خوب منکشف ہوگئی اور ہر صاحب نظر نے دیکھ لیا کہ دوستی کے پردہ میں کیا کارروائیاں کی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے مشورۂ غزوۂ روم نے شیعہ حضرات کو حواس باختہ کر دیا ہے، وہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اکابر نے بڑی محنتوں سے جو گھروندا بنایا تھا وہ اس مشورہ کے الفاظ کی ایک ایک ٹھیس سے خاک کے برابر ہوتا چلا جا رہا ہے، اس لیے پہلے بھی اس مشورہ کی تاویل وتوجیہ کی کوششیں کی گئی تھیں لیکن خود شیعوں نے بھی ان کوششوں کو لاحاصل سمجھا، اور ان توجیہوں کو اپنے لیے بے حد مضر تصور کیا، اس لیے سید العلماء صاحب نئے ساز وسامان سے بات بنانے کے لیے اٹھے مگر افسوس کہ بننے کے بجائے بات اور زیادہ بگڑ گئی، کہاں تو یہ دعویٰ تھا کہ حضرت علی کی امامت منصوص من اللہ تھی، تمام انبیاء سے ولایت علی وبقیہ ائمہ کا عہد ومیثاق لیا جاتا تھا، حضرت آدم کا جنت سے نکلنا اور ان پر عتاب خداوندی اسی مسئلۂ امامت کی بدولت تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار تاکید ہوئی کہ امامت علی کا اعلان کیجیے اور جب مخالفین کی وجہ سے آپ کو کچھ تامل ہوا تو آیت ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ نازل ہوئی، لہذا آپ نے غدیر خم میں امامت علی کا اعلان کیا اور لوگوں سے اس پر عہد لیا، لیکن اس عہد پر سوائے ابوذر، عمار، مقداد اور سلمان کے اور کوئی قائم نہ رہا، عقائد کی کتابوں میں نہایت دھوم دھام سے یہ ثابت کیا کہ مسئلۂ امامت بھی اصول دین سے ہے، جس طرح توحید ورسالت پر ایمان لانا ضروری ہے، مسئلۂ امامت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

کتب عقائد کو چھوڑیئے، کافی جو اصول اربعہ شیعہ میں چوٹی کی کتاب ہے، اس میں معصومین کی صدہا احادیث سے مسئلۂ امامت کا اصول دین سے ہونا اور اس کے انکار کا موجب کفر ہونا، صحابہ کا اسی مسئلہ کی وجہ سے مرتد ہونا، اور خلفائے ثلثہ وحضرت علی کے مابین اسی مسئلہ کا مدار اختلاف ہونا مذکور ہے، لیکن سید العلماء صاحب جب حضرت علی کے اس مشورہ کی توجیہ کرنے بیٹھے، تو ان ساری باتوں کو بھول گئے، اور حضرت علی کی مخالفت خلفاء کو ذاتی مخالفت ونفسانیت، ان کے اختلاف کو ذاتی اختلاف اور حضرت علی کے مخالفانہ جذبات کو نفسانی جذبات، اور ان کے اغراض ومقاصد کو ذاتی اغراض ومقاصد قرار دینے لگے ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر مسئلۂ امامت کا اصول دین سے ہونا صحیح ہے تو سید العلماء کی مذکورہ بالا

توجیہ غلط ہے، اور اگر یہ توجیہ مطابق واقع ہے تو مسئلۂ امامت کی جو مذہبی اہمیت بیان کی جاتی ہے وہ سب غلط ہوئی جاتی ہے۔

سید العلماء کی اس توجیہ پر مجھ کو ابھی بہت کچھ کہنا ہے لیکن اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں ۔

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

کیا یہ مشورہ دلیل محبت وخلوص نہیں ہے؟

اس کے بعد سید العلماء نے لکھا ہے کہ:

''پھر کیا یہ تھا کہ حضرت کو خلیفۂ وقت سے محبت اتنی تھی کہ وہ ان کے جنگ میں جانے کے روادار نہ تھے، اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ شہید نہ ہوجائیں تو پھر مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا یہ خیال بھی افسوس ہے کہ صحیح نہیں ہے'' (ص ۱۰۱ وص ۱۰۲)

میں سید العلماء صاحب کو یہ کس طرح سمجھاؤں کہ جب آپ کی تحریر سے خود ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ وحضرت عمرؓ کے مابین کوئی مذہبی واصولی اختلاف نہ تھا، بلکہ ذاتی وشخصی اختلاف تھا اور ہم نے ثابت کردیا کہ حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ سے کوئی ذاتی مخالفت نہ تھی، اس لیے کہ مفاد شخصی کے واسطے کسی سے دشمنی وعداوت رکھنا ان کی عظمت وجلالت مرتبہ کے بالکل منافی ہے، پس حضرت علی کو حضرت عمر سے کوئی مخالفت نہ تھی۔

میں سید العلماء کو کس طرح سمجھاؤں کہ جناب والا یہ کسی کا خیال نہیں ہے.....................
.... یہ مضمون تو اس مشورہ میں صراحۃً مذکور ہے جیسا کہ میں آگے اس کی وضاحت کروں گا، اس لیے اس مضمون کا رد اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ آپ حضرت علی کی تکذیب نہ کریں، (معاذ اللہ) یا اس مشورہ کے ثبوت ہی کا انکار نہ کردیں۔

باقی رہا آپ کا یہ خیال کہ اگر یہ مشورہ بنابر محبت تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات حسنین سے تو حضرت علی کو کہیں زیادہ محبت تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ حضرت علی نے نہیں دیا اور کیا سبب ہے کہ حضرات حسنین کو جنگ جمل وصفین میں اپنے ساتھ لیے رہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو آپ ثابت کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کب اس قسم کا کوئی مشورہ لیا اس کے بعد یہ سوال کیجئے۔

ثانیاً:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بلاد عرب سے باہر کسی لڑائی کا موقع نہیں آیا، جس میں اسلامی مرکز سے صدہا میل کی مسافت پر مدتوں قیام کرنے کی ضرورت ہوتی۔

ثالثاً:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سلطنت اسلامیہ کا رقبہ اور حکومت کا انتظامی کاروبار اتنا وسیع نہ ہوا تھا جتنا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر کی انتظامی قابلیتوں میں بھی آسمان وزمین کا تفاوت ہے، اس لیے عہد نبوی پر عہد فاروقی کو قیاس نہ کرنا چاہئے۔

رابعاً:- خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کیا ہے کہ جس جنگ میں اپنی شرکت مناسب یا ضروری سمجھی ہے وہاں بنفس نفیس تشریف لے گئے ہیں اور جہاں دوسرے سپہ سالار کی سرکردگی میں کام ہوجانے کی امید پائی ہے وہاں کسی دوسرے کو بھیج دیا ہے، کیا آپ نے مغازی وسیر میں سرایا کا ذکر نہیں پڑھا، پس جب حضرت علی مشاہدہ کررہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی موقع دیکھ کر جہاں جو مصلحت ہوتی ہے کرتے ہیں تو خواہ مخواہ دخل در معقولات کیوں کرتے، بالخصوص جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں ان سے استصواب بھی نہیں کیا۔

اب رہا جنگ جمل وصفین کا معاملہ: اولاً تو ان دونوں واقعوں میں لڑائی اتفاقی طور پر پیش آگئی تھی اصل معاملہ تو دوسرا تھا۔

ثانیاً:- یہ لڑائیاں کفار کے مقابلہ میں اور دعوت اسلام کے سلسلہ میں نہ تھیں، کہ جو کوئی بھیج دیا جاتا کام ہوجاتا، یہاں تو ایک ایسا نزاعی معاملہ تھا جس کا تعلق براہ راست حضرت علی سے تھا اور بدون ان کی موجودگی کے اس کے روبراہ ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے بذات خود ان کی شرکت ضروری تھی۔

ثالثاً:- حضرات حسنین سے حضرت علی کو طبعی محبت بیشک حضرت عمر سے زیادہ ہوگی، لیکن یہاں طبعی محبت کی گفتگو نہیں ہے، یہاں تو یہ گفتگو ہے کہ حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ سے ان کے حسن انتظام اور بے نظیر تدبر وسیاست اور ان کی عظمت وجلالت کی بناء پر عقلی محبت بغایت درجہ تھی۔

رابعاً: – حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو جنگ فارس میں جانے سے اس بنیاد پر روکا ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ شہید ہوگئے، تو پھر مسلمانوں کا کوئی پشت پناہ نہ رہے گا، (جیسا کہ ان کے خطبہ میں مصرح ہے) اور یہ بنیاد حضرات حسنین میں نہیں پائی جاتی تھی، اس لیے کہ صحابۂ کرام میں، تدین وتورع، انتظام حکومت و جہانبانی اور جنگی قابلیت کے لحاظ سے حضرات حسنین کے مثل بلکہ ان سے بہتر وبرتر متعدد اشخاص موجود تھے، اس لیے ان کو جنگ سے روکنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اس تقریر سے اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ یہ مشورہ بے شبہہ محبت، خلوص اور عقیدتمندی پر دلالت کرتا ہے اور اس پر جو شبہات کئے جاتے ہیں وہ حد درجہ رکیک ہیں، اور اسی تقریر سے سید العلماء کی ایک دوسری بات کی لغویت بھی ظاہر ہوتی ہے، وہ بات یہ ہے:

''محبت کی بناء پر جو بات ہے حقیقۃً مشورہ نہیں ہوا کرتا اسے حضرت کو ماننے کی کیا ضرورت تھی'' (ص۱۰۳)

سید العلماء کا یہ نظریہ اگر محبت طبعی کی نسبت ہے تو ایک حد تک صحیح ہے، لیکن یہاں مشورہ کی بنیاد محبت طبعی نہیں ہے، بلکہ محبت عقلی ہے، اور محبت عقلی کی بناء پر جو مشورہ دیا جائے اور اس کی تائید دوسرے عقلاء بھی کریں اور مشورہ لینے والے کو بھی اس مشورہ کی معقولیت سمجھ میں آجائے تو اس کی مخالفت ہر عاقل کے نزدیک قبیح ہے۔

ہاں محبت طبعی کی بناء پر کوئی ایسی بات کی جائے جو مصالح عقلی کے خلاف ہو، اس کا ماننا البتہ ضروری نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی شرعی مصلحت اس کے ماننے کی طرف داعی ہو تو اس کو بھی ماننا پڑے گا۔

حضرت علیؓ کا وہ فقرہ جس کا ایک ایک لفظ خلوص وعقیدتمندی میں ڈوبا ہوا ہے، حضرت علیؓ اس مشورہ میں فرماتے ہیں:

انک متی تسیر الی ھذ العدو بنفسک فتلقھم فتنکب لا تکن للمسلمین کانفة دون اقصی بلاد ھم فلیس بعدک مرجع یرجعون الیه.

بتحقیق جس وقت آپ اس دشمن کے سامنے خود جائیں گے اور خود ان سے مقابلہ کریں گے تو اگر کہیں شہید ہوگئے تو پھر مسلمانوں کو کوئی جائے پناہ ان کے آخری شہروں تک کہیں نہ ملے گی کیوں کہ آپ کے بعد کوئی ایسا شخص جس کی طرف مسلمان

رجوع کریں نہیں ہے۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ یہ مضمون کہ اگر حضرت عمر شہید ہوگئے تو پھر مسلمانوں کو کوئی جائے پناہ نہ ملے گی، حضرت علی کے کلام میں بالتصریح مذکور ہے، اب آپ اس فقرہ کو پڑھیے اور میرے دعویٰ کی تصدیق کیجیے، سید العلماء نے جب اس فقرہ کو پڑھا ہے تو ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ اس فقرہ نے رزارہ اور ابوبصیر صاحبان کی ساری محنت غارت کردی اس لئے اس فقرہ کی معنوی تحریف پر تل گئے۔

''نکب کے معنی عربی لغت کی کتابوں میں ''شہید ہونے'' کے نایاب ہیں، بلکہ نکب کے معنی ہیں اپنی جگہ سے ہٹنا (عدل) یا شکست کھانا (کسر)''

مجھے سید العلماء کی اس بے مائیگی پر تعجب ہوتا ہے، معلوم نہیں انھوں نے عربی لغت کی کون کون سی کتابیں دیکھی ہیں، ہم اس وقت بہت سے حوالے نقل کرکے ان کی بدحواسی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے صرف دو تین حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

ا:-لغت کی بہت متداول کتاب صراح میں ہے: **نکبة** بالفتح رنج دررنج رسانیدن، ایک سطر کے بعد ہے: **نکب فلان فهو منکوب**، منجد کا عیسائی مصنف لکھتا ہے: **نکب اصابته نکبة** پھر لکھتا ہے **النکب المصیبة** ج نکوب پھر لکھتا ہے **النکبة المرة، من نکب المصیبة ج نکبات**، نہایہ اور اس کی تلخیص میں ہے **النکبة ما یصیب الانسان من الحوادث** قاموس میں ہے۔

دیکھئے ان تمام حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکب کے معنی رنج پہنچانے یا مصیبت پہنچانے اور تکلیف دینے کے ہیں، اور نکب مجہول کے معنی تکلیف ومصیبت پہنچائے جانے کے ہیں، پس حضرت علی کے اس فقرہ کا اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا کہ:

''پس اگر آپ تکلیف ومصیبت پہنچائے جائیں یا آپ شکار حوادث ہوجائیں تو مسلمانوں کے لیے ان کے آخری شہروں تک کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔''

اور ظاہر ہے کہ ایسی مصیبت جس کے بعد کوئی جائے پناہ نہ ملے موت ہی کی مصیبت ہوسکتی ہے، اور چونکہ یہ موت دعوت اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں ہوتی اس لیے اگر تنکب کا

ترجمہ ''شہید'' ہو جائیں، کیا گیا تو بالکل ٹھیک اور نہایت درست ہے۔

سید العلماء کو خبر نہیں ہے کہ عربی میں موت یا موت کے صدمہ کو اسی قسم کے کنایوں میں عموماً ذکر کیا جاتا ہے، کوئی مرجاتا ہے تو کہا جاتا ہے **أصیب فلان** (یعنی فلاں شخص مصیبت پہنچایا گیا یعنی مرگیا) اور اگر کسی کا لڑکا مرجائے تو کہا جاتا ہے **اصیب فلان بولدہ فُجع فلان بولدہ** (یعنی فلان شخص کو اس کے لڑکے کی وجہ سے یا لڑکے کے ساتھ رنج پہنچایا گیا یعنی اس کا لڑکا مرگیا)

میں سید العلماء کی اس بات کو مانتا ہوں کہ لغت میں **نکب** کے معنی عدل کے بھی ہیں، لیکن عدل کے معنی میدان جنگ سے ہٹنے اور میدان جنگ کو چھوڑنے کے ہرگز نہیں ہیں، بلکہ راستہ سے ہٹنے کے معنی ہیں، اور اگر بالفرض میدان جنگ سے ہٹنے کے معنی میں بھی **نکب** بولا جاتا ہو، تو سید العلماء کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس صورت میں یہ فعل لازم ہوگا، اور فعل لازم کا مجہول نہیں آتا، جب تک کہ اس کو متعدی بالحرف نہ بنائیں اور یہاں **تنکب** مجہول ہی مروی ومنقول ہے، لہذا اس کو عدل کے معنی میں لینا عربیت سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔

یہ تو سید العلماء کی بے مائیگی کا حال تھا، اب ذرا ان کی غلط بیانی پر بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈالئے، لکھتے ہیں کہ لغت میں نکب کے معنی **کسر** یعنی شکست کھانے کے آتے ہیں، حالانکہ اس معنی کا کتب لغت میں کہیں وجود نہیں ہے، اگر سید العلماء صاحب کچھ بھی صداقت رکھتے ہوں تو لغت کی کسی معمولی ہی کتاب کا حوالہ دیں۔

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ ''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں اس فقرہ کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح اور مطابق لغت ہے، اور سید العلماء نے اس فقرہ کا جو مفہوم قرار دینا چاہا ہے وہ کتب لغت کے بالکل خلاف ہے اور اگر لغت سے قطع نظر کرلیا جائے تب بھی سید العلماء کا ترجمہ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ حضرت علی نے اس فقرہ کے اخیر میں صاف صاف یہ بھی فرمادیا ہے: **فلیس بعدک مرجع یرجعون الیہ** یعنی اس لیے کہ آپ کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کی طرف مسلمان رجوع کریں، حضرت علی کا یہ فقرہ اسی وقت بامعنی ہوسکتا ہے جب **تنکب** کے معنی شہید ہوجانے کے ہوں، ورنہ شکست کھا کر زندہ واپس آنے کی صورت میں آپ کے بعد کیا مطلب؟

سید العلماء صاحب کے دل میں بھی یہ بات کھٹکی تھی، اس لیے انھوں نے عوام شیعہ کی

آنکھوں میں خاک جھونک کر بعدک (آپ کے بعد) کے ترجمہ میں علانیہ تحریف سے کام لے کر (آپ کی شکست کے بعد وہاں) ترجمہ کیا، اوراس سے ماقبل کے الفاظ **لا تکن للمسلمین کا نفة دون اقصی بلادھم** کے ترجمہ میں صریح فریب کاری سے کام لیتے ہوئے یہ لکھا (تو مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ ان دشمنوں کی سرحد کے قریب نہ ہوگی) حالانکہ **بلادھم** کی ضمیر مضاف الیہ مسلمین کی طرف راجع ہے جو صراحتہ اس جزو جملہ میں مذکور ہے اور صحیح لفظی ترجمہ یہ ہے (تو مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ ان کے بلاد مملوکہ میں سے دور ترین شہر کے پاس بھی نہ ملے گی) جس کا صریح مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ان کے آخری شہروں تک کوئی جائے پناہ نہ ملے گی۔

نیز اگر **بلادھم** کی ضمیر کا مرجع اعداء ہی کو مان لیا جائے تب بھی سید العلماء کا ترجمہ غلط ہے اس تقدیر پر صحیح ترجمہ یوں ہوگا:

''مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ دشمنوں کے مقبوضہ ممالک میں سے انتہائی دور شہر کے سوا یا پاس نہ ہوگی''۔

جو بے معنی اور لغویات ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ **بلادھم** کی ضمیر کا مرجع مسلمین ہی ہے۔

الغرض اس فقرہ کے ترجمہ میں سید العلماء نے خوب خوب قلابازیاں کھائی ہیں اور اپنی عربی دانی و دیانت داری کو بری طرح رسوا کیا ہے۔ اب اخیر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک شیعہ ہی کے کلام سے اپنے بیان کئے ہوئے ترجمہ کی تصدیق پیش کردوں، ملاحظہ کیجئے علامہ ابن ابی الحدید زیدی شیعہ شرح نہج البلاغۃ مطبوعہ مصر ج۲ ص۳۹ میں لکھتے ہیں:

أشار علیه السلام أن لا یشخص بنفسه حذراً أن یصاب فیذهب المسلمون کلهم لذهاب الرأس بل یبعث أمیراً من جانبه علی الناس ویقیم هو بالمدینة فإن هزموا کان مرجعهم إلیه.

حضرت علی نے اپنے اس فقرہ میں حضرت عمر کو یہ مشورہ دیا کہ وہ خود (جنگ میں) نہ جائیں، اس اندیشہ کی وجہ سے کہ اگر کہیں وہ شہید ہوگئے تو سر (یعنی سالار لشکر) کے جاتے رہنے کی وجہ سے سارے مسلمان جاتے رہیں گے (اس لئے وہ نہ جائیں) اپنی طرف سے لوگوں پر ایک امیر مقرر کر کے بھیج دیں اور خود مدینہ میں مقیم رہیں، تاکہ اگر وہ لوگ پسپا ہوں تو حضرت عمر ان کے لیے جائے پناہ ہوں۔

اسلامی کتب خانے

(چوتھی قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی   ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

غالبًا رومن کلچر کا سب سے زیادہ مشہور اور اہمیت کا حامل کتب خانہ وہ ہے جس کو رومن فرمانروا تراگان **Tragan** (۵۳-۱۱۳ء) نے قائم کیا تھا، تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قیام ۱۰۰ء میں عمل میں آیا تھا، اور اس کا نام کتب خانۂ الپیا ***Ulpia*** رکھا گیا تھا، کتب خانۂ اسکندریہ کے بعد قدیم تہذیب وتمدن کا یہ تیسرا اہم کتب خانہ سمجھا جاتا ہے، یہ کتب خانہ عام رومن ریکارڈوں کا مرکز تھا، اس کے دو حصے تھے، ایک یونانی، دوسرا رومانی۔ کتابوں کے ساتھ حکومت کی اہم دستاویزات بھی اس میں محفوظ کی گئی تھیں، اس دور اور شہر کے نامور اہل علم کی زیر نگرانی تھا، جن کے ماتحت ملازموں کی ایک بڑی تعداد اس میں کام کرتی تھی۔ پھر اس میدان میں روما کی نقل اٹلی کے شہروں نے بھی کی۔

جہاں تک ان کتب خانوں کے قواعد وضوابط کا سوال ہے، تو ہر عوامی کتب خانے کا ایک لائبریرین Librarian ہوا کرتا تھا، اور متعدد مددگار اس کا تعاون کیا کرتے تھے، کئی رومن فرمانرواؤں نے تو بڑے عوامی کتب خانوں کے لیے کئی کئی نسخہ نویسوں کا بھی انتظام کیا تھا، ان کتب خانوں میں لوگوں کی راحت رسانی کا بھی خیال کیا جاتا تھا، اور ان سے ملحق ایسی عمارتیں بنائی جاتی تھیں جن میں گرم پانی کے ساتھ حماموں کا بھی انتظام رہتا تھا۔

اغلب یہ ہے کہ رومن پبلک لائبریری میں کتابوں کو باہر لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اور اس کی گیلریاں مطالعہ وکتب بینی اور علمی بحث ومباحثہ کے لیے بہترین جگہیں ہوتی تھیں، پھر بھی کچھ ایسے کتب خانے بھی تھے جن میں اس کی اجازت ہوتی تھی کہ کتابوں کو باہر لے جایا جائے۔

یونانی اور رومن لائبریریوں کی تاریخ تقریباً چھ سو سال پر ممتد ہے، ان کی تاریخ بنیادی امور میں بہت حد تک مشرقی کتب خانوں پر منحصر تھی، اور انھوں نے اپنے نظم ونسق میں مشرق کے کتب

خانوں سے بہت استفادہ کیا ہے، یہاں تک کہ ان کی عبادت گاہیں اور شرفاء کے محلات اپنے پرائیویٹ کتب خانوں پر فخر کیا کرتے تھے۔

چوتھی صدی عیسوی ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ رومن ایمپائر کی بنیادیں متزلزل ہونا شروع ہوگئیں، رومن کلچر میں طبعی عوامل ہی کتابوں اور کتب خانوں کے تنہا دشمن نہیں ثابت ہوئے، بلکہ نئے حملہ آوروں کی بربریت، تخریب کاری، چوری، مذہبی تعصب، فکری ایجادات اور تہذیبی ترقیات پر ان کی ضرب کاری نے اس تہذیب کے کتب خانوں کے لیے کدال اور کلہاڑوں سے زیادہ خطرناک رول ادا کیا، یہ سب رومن ایمپائر کے سقوط کی ابتدا میں یعنی تقریباً ۳۷۸ عیسوی میں پیش آیا، اس صورتحال اور ملک کے آئندہ انجام کو دیکھ کر رومن مؤرخ ''امیانوس مارسلینوس'' نے کہا تھا کہ: ''کتب خانے قبروں کی طرح ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جائیں گے''۔

مغربی رومن ایمپائر کی اس گرتی ہوئی حالت کے باوجود سلطنت کے مشرقی حصوں میں علمی وتہذیبی سرگرمیاں جاری تھیں، چنانچہ مشرقی رومن ایمپائر (بیزنطی) نے بھی کتب خانوں کے قیام اور فراہمیٔ کتب کا اہتمام کیا۔

اس کے کتب خانوں میں سب سے زیادہ شہرت کا حامل قیصر قسطنطین کا کتب خانہ تھا، جس کو اس نے ۳۵۳ء میں قائم کیا تھا، قسطنطنیہ اور بیزنطی دنیا- آج کے ترکی کا استنبول- میں فن وثقافت کو فروغ دینے کے لیے اس کے دوش بدوش ایک اکیڈمی کا قیام بھی عمل میں آیا۔

اس کتب خانہ نے زمانۂ قدیم کے بہت سے اہم مجموعوں کی حفاظت کی، پھر اس کا انجام کیا ہوا، اس کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہوسکا، لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صلیبی جنگوں تک زندہ رہا، اور اس کا ایک حصہ قسطنطنیہ کی عثمانی فتوحات ۱۴۵۳ء تک باقی رہا، جس کی وجہ سے اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ وہ پہلے عثمانی سلطان کے کتب خانے میں ضم ہوگیا۔

اسی طرح بادشاہ جولیان نے - جو علم وادب کا بڑا دلدادہ تھا- قسطنطنیہ میں ایک دوسرا بڑا کتب خانہ قائم کیا، جس میں یونانی اور رومانی علوم کی کتابوں کا ایک سرمایہ فراہم کیا۔

ازمنۂ وسطی میں ملک کے داخلی انتشار اور خانہ جنگیوں کے دوران قدیم یونانی اور رومن کتب خانے لوٹ پاٹ، آتش زنی اور تباہ کاری کے شکار ہوگئے۔ اور بجز تھوڑی سی قدیم کتابوں کے کچھ باقی

نہیں بچا، تا آنکہ مسلمان آئے اور انھوں نے سریانی زبان کے واسطے سے عربی زبان میں منتقل کیا، اسی کی نسبت ریمنڈ ایرون لکھتا ہے: ''یونانی سرمایہ ہم تک دو راستوں سے پہنچا ہے: ایک رومن راستہ اور دوسرا عربوں کا راستہ''۔

ملک فارس کے کتب خانے:

شاہان فارس کی توجہ سے ملک فارس میں بھی کتب خانوں کو فروغ حاصل ہوا۔

فارس کی ترقی شاہ نوشیرواں (۵۳۱-۵۷۹ء) کے عہد میں اپنے اوج کمال کو پہنچ چکی تھی، نوشیرواں بیزنطی فرمانروا گسٹینان کا معاصر تھا، بہت دور اندیش، علم وادب کا دلدادہ، اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا تھا، گسٹینان نے ۵۲۹ء میں جب یونانی فلسفیوں کو اثینا سے نکال کر ان کو ملک بدر کیا، اور انھوں نے سلطنت فارس میں پناہ طلب کی، تو نوشیرواں نے ان کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی، اور سلطنت فارس کے قلب میں واقع شہر ''جندیسا پور'' میں ان کو آباد کیا۔

ملک روم کے ان تارکین وطن یونانی علماء نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا، اور جندیسا پور میں طب کا ایک مدرسہ قائم کیا، جو اسلامی فتوحات کے زمانے حتی کہ عباسی خلفاء کے عہد تک زندہ وتابندہ رہا، چنانچہ متعدد اطباء اور مترجمین اس شہر کی طرف منسوب ملتے ہیں، جن میں خاندان بختیشوع بطور خاص قابل ذکر ہے۔ ان علماء اور ان کے تلامذہ نے یونانی فکر کو سریانی اور فارسی زبانوں میں منتقل کیا۔

شاہان فارس اپنے محلات میں کتابوں کو جمع کرتے اور ان پر فخر کیا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے امتداد زمانہ کے ساتھ علم کی مختلف شاخوں میں کتابوں کے بہت سے خزانے جمع کیے۔

''ازدشیر بابک'' (۲۲۶-۲۴۱ء) فارس کا سب سے مشہور بادشاہ اور علم دوستی، علماء نوازی اور کتابوں کی فراہمی میں شاہان فارس میں سب سے نامور اور ممتاز تر تھا۔ وہ کتابوں کی فراہمی کے لیے ہندوستان، روم اور چین میں اپنے وفود بھیجا کرتا تھا۔

اس کی تائید مشہور مؤرخ مسعودی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ: ''اس نے ان کے علوم کی - فارسیوں کے علوم کی - ایک کتاب سے مدد لی ہے، یہ کتاب عہد گزشتہ میں فارس کے شاہی کتب خانے میں تھی۔ اور اسلامی فتوحات کے وقت وہ مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگی، پھر عربی زبان میں منتقل کی گئی[1]۔''

---

(۱) مروج الذهب: ۱/۱۷

نیز احمد امین نے اپنی کتاب "ضحی الاسلام" میں لکھا ہے کہ: "تاریخ بغداد کے مصنف طیفور نے ذکر کیا ہے کہ عجمیوں کی کتابیں عہد عباسی میں ترجمہ ہوئیں، اور یہ مرو کے کتب خانے میں موجود تھیں[1]"۔

جب اسلامی دور حکومت آیا، اور علوم وفنون اور ان کے نقل وترجمہ وتعریب کی گرم بازاری ہوئی، تو مسلمانوں کو یہ یونانی کتابیں سریانی یا فارسی دونوں میں سے کسی ایک زبان میں نقل شدہ ملیں۔

حق یہ ہے کہ کتابوں اور کتب خانوں کی تاریخ میں مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا ہے، وہ نہایت زبردست اور عظیم الشان ہے، انھوں نے گزشتہ قوموں کے علمی وفکری سرمائے کو عربی زبان میں منتقل کیا، اور اختراع وایجاد اور فروغ وترقی کی اپنی تمام استعداد وصلاحیت سے کام لے کر اس میں اضافہ کیا۔ یہ منقولات اور پھر ان کے اپنے اضافات ان کے ہاتھوں میں امانت رہے، یہاں تک کہ بارہویں صدی میں انھوں نے اس سرمائے کو یورپ کے حوالے کر دیا، جس پر یورپ نے اپنی جدید ترقیات کی عمارت کھڑی کی، اس طرح مسلمان ثقافت وکلچر کا بہترین واسطہ بن کر رہے، اور ان کے کتب خانے قدیم زمانے کی انسانیت کے سرمائے کے محفوظ اسٹور روم رہے، جیسا کہ آئندہ بحث میں خدا کی توفیق، اس کے فضل واحسان اور مشیت سے اس کا بیان ہوگا۔

بحث دوم
اسلامی کتب خانوں کی نشو ونما اور ان کی اہمیت

تمہید:

اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی بیرونی دنیا سے ایک طرح سے الگ تھلگ تھی، فارس وروم اور حبشہ کے لوگوں سے ان کے معمولی تعلقات تھے، ان تعلقات میں اہم ترین تعلق تجارت کا تھا، ان کی زندگی ہی کی مناسبت سے ان کے علوم بھی معمولی سے تھے، انساب کا ان کو بڑا اہتمام تھا، ان کو اپنے واقعات اور جنگی کارناموں کی حفاظت سے غیر معمولی دلچسپی تھی، شاعری ان کے کلچر کی اساس تھی، اور انھوں نے اشعار کو یاد کرنے اور ان کو سننے سنانے پر بہت توجہ صرف کی، راویان شعر کے سینے لمبے لمبے

(۱) ضحی الاسلام: ۳/ ۱۸۰

قصیدوں اور گزرے ہوئے عربوں کے واقعات کے سفینے ہوتے تھے، اوران سینوں میں روزمرہ کے امثال ومحاورات اور فصیح وبلیغ خطبوں کا دریا موجزن ہوا کرتا تھا، ان کمالات میں ان کے مقابلے ہوتے، اور ادب وثقافت کے بازاروں اور عام مجمعوں میں ان پر گفت وشنید کرتے، ان کے بازاروں اور میلوں میں تین بہت شہرت کے حامل تھے، عکاظ، مجنہ، اور ذوالمجاز۔

علمی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ایک حصہ -جنوبی عرب کے لوگ- لکھنے کے فن سے واقف تھے، چنانچہ یہ لوگ اپنے اہم تاریخی واقعات کو جانوروں کی ہڈیوں، کھجور کے پتوں اور پتھروں پر لکھ لیا کرتے تھے، لیکن ان کی جو تحریریں ہم کو دستیاب ہوئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ جمع وتدوین سے ان کی دلچسپی بہت نادر تھی، اور واقعہ نویسی ان کے خاص خاص طبقوں میں ہی منحصر تھی۔

فکری پیداوار کی حفاظت واشاعت میں بنیادی طور پر ان کا انحصار یادداشت پر تھا، اور انھوں نے تدوین وکتابت سے زیادہ سننے اور یاد کرنے کا اہتمام کیا، حالانکہ کتابوں اور نوشتوں میں جو چیزیں محفوظ ہوجاتی ہیں، وہ حافظوں اور یادداشتوں میں نہیں ہوتیں۔ بلفظ دیگر اسلام سے پیشتر عربوں کے پاس لکھے ہوئے ریکارڈ نہیں تھے۔

اسی طرح اس دور میں ان کے ہاں کتب خانے ناپید تھے، جس کا سبب ان کی خانہ بدوشانہ زندگی، اشیاء کتابت کا فقدان اور ناخواندگی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ عہد جاہلی کا قدیم ترین نوشتہ امرؤالقیس کی قبر کھدائی میں دریافت ہوا ہے، جس پر ''نص النّمارة'' یا ''نقش النّمارة'' کا اطلاق ہوتا ہے۔

عربوں کے ہاں کتابت اور علم کی اشاعت میں اسلام کی روشنی کے اثرات:

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام کا ظہور عربوں کے ہاں تدوین وکتابت کے ایک نئے عہد کا آغاز تھا، اسلام کی دعوت کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر کتابت کو بھی فروغ حاصل ہوا، اور مسلمان عربوں نے کتابوں پر غیر معمولی توجہ صرف کی۔ عربوں کے ہاں قرأت وکتابت کی جو قدردانی ہوئی، قلقشندی نے اس کے متعدد دلائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی قدرومنزلت اور بلندیٔ رتبہ کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی مقدس کتاب کی سب سے پہلی سورۃ میں اس کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ

مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں اشرف الانبیاء اور اکرم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی وتنزیل کا نقطۂ آغاز ہیں، اور اس سے کتابت کے جس اہتمام اور بلندئ مقام کا ثبوت بہم پہنچتا ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔

مذہب اسلام کے انتشار، فتوحات کی وسعت اور امن وامان کے استحکام کے بعد، اور عالم اسلام میں علم ومعرفت کے فروغ کے نتیجے میں، اور مسلمان جس نئ زندگی سے روشناس ہوئے تھے اس کے نتیجے میں، اسلامی دنیا میں کتب خانوں کا ظہور ہوا۔ پھر مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں سابقہ تہذیبوں کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کیا، اور ان قوموں سے ان کا اختلاط ہوا جو مختلف تہذیبی تجربات سے گزر چکی تھیں، اس آمیزش کے نتیجے میں ایک ایسی ترقی یافتہ اسلامی تہذیب وثقافت کا ظہور ہوا، جس نے اپنے دامن میں تمام سابقہ تہذیبوں کی خوبیوں کو سمیٹ لیا۔

مسلمانوں نے اپنے دین ومذہب کی ان تعلیمات سے فائدہ اٹھایا جو علم کی تحصیل واشاعت کی ترغیب دیتی ہیں، اور انھوں نے متقدمین کے علوم سے سیراب ہونا شروع کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ عملی ترقی جس کی اسلام نے تحریک کی تھی، اور جس کو مسلمانوں نے حرز جان بنالیا تھا، کتابوں اور کتب خانوں کے ساتھ ان کی دلچسپی کا سب سے بڑا سبب اور محرک تھی، یہ ہمہ گیر ترقی اسلام کی اسی ترغیب وتحریک کا نتیجہ تھی جو اس نے مسلمانوں کو تعلیم وتعلم کے سلسلے میں عطا کی تھی، اور علم وروشنی کی یہ وہ ترغیب تھی جس کی مثال انسانیت کی تاریخ میں نہ پہلے تھی نہ بعد میں ہوئی۔

مسلمانوں نے ہر اچھی بات اور حکمت ودانائی سے محبت کی، فصاحت وبلاغت میں ان کے لیے بلا کی جاذبیت اور کشش تھی، اور جب مفتوحہ ممالک میں ان کو استقرار حاصل ہوا، تو فصاحت وبلاغت کی وہ کشش تو برقرار رہی، اس کے ساتھ کتابوں کی محبت واحترام کے جذبے کا اضافہ ہوگیا۔

اسلامی تہذیب اور اشاعتِ علم بذریعہ کتب:

اسلام کی اہم اور نمایاں خصوصیات میں کتابوں سے اس کی محبت ہے، اور کتابوں کے واسطے سے علم کی اشاعت، کتب خانوں کا قیام اور عام لوگوں کے لیے ان کی فراہمی ہے۔ کتابوں کی محبت اور ان کی حفاظت کے معاملے میں روئے زمین کی کوئی قوم مسلمانوں سے آگے نہیں بڑھ سکی، ول ڈیورانٹ اپنی کتاب قصۃ الحضارۃ میں رقم طراز ہے: ''دنیا کے ملکوں میں سے کسی ملک میں۔ بجز چین کے۔ فراہمی

کتب سے وہ شغف نہیں رہا، جو آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں صدی میں ممالک اسلامیہ میں رہا، جب یہ ممالک اپنی ثقافتی زندگی کی بلندی تک پہنچ چکے تھے، اور جب قرطبہ سے سمرقند تک کے اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی ہزاروں مساجد کے علماء کی تعداد ان کے ستونوں کی تعداد سے کم نہیں تھی۔"(۱)

جاحظ کو دیکھئے کہ وہ کتابوں میں اس طرح محو رہتا تھا جیسے کوئی شخص اپنے اکلوتے لڑکے سے محو گفتگو ہو، اور ان بلیغ اوصاف میں کتاب کی توصیف کرتا ہے: "کتاب علم سے لبریز ایک برتن ہے، کتاب وہ ہم نشیں ہے جو تمھاری بے جا تعریف نہیں کرتی، اور وہ دوست ہے جو تم کو دھوکہ نہیں دیتی، کتاب رات کے وقت بھی تمھاری اسی طرح اطاعت وفرمانبرداری کرتی ہے، جس طرح دن کی روشنی میں کرتی ہے"۔

عربی ادب کی کتابیں اس طرح کی بہترین اور بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہیں، کتابوں کی یہ غیر معمولی قدر دانی ان کے وجدان کی گہرائی اور ان کے اس دین ومذہب کی تعلیمات کا فیض ہے جو علم وحکمت کے احترام کی ترغیب دیتا ہے۔ خلفاء اور امراء خود بھی کتابوں کی قدر دانی کرتے تھے، اور کتابوں کو مناسب رتبہ دیتے تھے۔

کتابوں کی محبت، ان کی قدر دانی اور فراہمی کی خواہش علماء ومحققین تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ عام لوگوں میں بھی یہ شوق پایا جاتا تھا۔

عربوں کی کتاب دوستی یہاں تک بڑھی کہ ان کے ہاں کتابیں امن وسلامتی کی سفارت کار اور مصالحت کی شرائط میں ایک شرط بن گئیں۔ مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید کے حالات میں ہے کہ وہ عموریا اور انقرہ کی فتوحات کے بعد یونانی مخطوطات کو اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، اسی طرح اس کا لخت جگر مامون بیزنطیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد جنگ کے خسارہ کی بھرپائی کے لیے تمام یونانی مخطوطات کا مطالبہ کرتا ہے، حالانکہ ابھی ان کا عربی میں ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔

ظہور اسلام کے آغاز میں اولین مسلمان کتب خانوں سے واقف نہیں تھے، جس کا سبب اس دور کے حالات تھے۔ کیونکہ وہ توحید کی دعوت کو پھیلانے کے لیے جہاد اور جد وجہد کا وقت تھا، اور اس عظیم مذہب کی بنیادوں کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے کا زمانہ تھا، اور بیشتر

(۱) قصۃ الحضارۃ: ۱۳/ ۱۷۱

مسلمان نوشت وخواند سے ناواقف تھے، مگران لوگوں نے قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے حفظ کا اہتمام کیا۔

اور چونکہ اسلام کے عہد آغاز میں علوم قرآن کریم، اس کی تفسیر اور روایت حدیث میں منحصر تھے، اس لیے شروع میں قرآن کریم اور حدیث شریف کی تدوین کا اہتمام ہوا، اور مسلمانوں نے جس طرح کتاب اللہ کی حفاظت وتدوین اور اس کی آیتوں کی درستگی کا اہتمام برتا کسی اور چیز کا نہیں کیا، تاکہ جو غیر عربی مسلمان ہیں وہ اس میں غلطی نہ کرسکیں، اسی وجہ سے قرآن کریم وہ پہلی کتاب ہے جو اسلام میں مدون ہوئی۔

اسی لیے قرآن کریم اور حدیث شریف کے نسخے مساجد کے کتب خانوں کی بنیاد کا پہلا پتھر سمجھے جاتے ہیں۔

اور تدوین قرآن کریم مسلمانوں کے عہد تدوین کا نقطۂ آغاز تھا۔

تدوین قرآن:

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شروع شروع میں مسلمان قرآن کریم کی حفاظت کے لیے قوت حافظہ پر اعتماد کیا کرتے تھے، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ ایسے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی موجود تھے، جو قرآن کریم کے متفرق حصوں کو کھجور کے پتوں، یا پتلے پتھروں، یا چوڑی چھالوں یا ان جیسی دوسری چیزوں پر لکھ لیا کرتے تھے، لیکن کتاب اللہ کی مکمل تدوین جنگ ارتداد کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچی جب مرتدین سے جنگ کے دوران صحابہ کرام -اور خاص طور سے قراء- کی پے در پے شہادت سے اس کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

تدوین کے کام کو صحابہ کی ایک جماعت نے انجام دیا، جن میں سرفہرست شیخ القراء حضرت زید بن ثابت -رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین- تھے۔ انھوں نے قرآن کریم کو باریک چمڑوں پر لکھ کر محفوظ کر دیا، چمڑوں کے استعمال کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ زیادہ مدت تک باقی رہتا ہے، یا یہ کہ وہی اس وقت دستیاب تھا۔

خلیفۂ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانۂ خلافت میں متعدد کتابت

کے ساتھ قرآن کریم کے کئی نسخے تیار ہوئے، آپ نے ان تمام نسخوں کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار کرا کر، اسلامی ممالک میں تقسیم کرنے اور باقی نسخوں کو دور رکھنے کے لیے، اس کی چار نقلیں تیار کرائیں، آپ کا مقصد یہ تھا کہ زمین کے گوشے گوشے میں موجود امت کو ایک قرأت پر جمع کر سکیں۔

تدوین قرآن کے بعد دوسری صدی ہجری میں منظّم طریقے سے احادیث نبویہ کی تدوین کے عمل کا آغاز ہوا، اس سے قبل حدیث کی تدوین کا کام بہت محدود پیمانے پر تھا، کہ بعض صحابہ کچھ احادیث کو پڑھنے اور یاد کرنے کے لیے لکھ لیا کرتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیات مبارکہ کے ساتھ اختلاط کے ڈر سے اپنی حیات مبارکہ میں تدوین حدیث سے منع فرما دیا تھا۔

اسلامی کتب خانوں کا آغاز مساجد کی نشو ونما کے ساتھ ہوا:

بہت سے مؤرخین زور دے کر یہ بات کہتے ہیں کہ عہد اسلامی کے کتب خانے مساجد کے ساتھ وجود میں آئے، کیونکہ عہد اسلامی کے اوائل میں مسجدیں محض عبادت کا مرکز نہیں ہوا کرتی تھیں، بلکہ تحصیل علم ومعرفت کا مقام اور اس سے بڑھ کر کہ وہ حکومت اسلامیہ کے انتظام وانصرام اور کام کاج کی انجام دہی کا مرکز ہوا کرتی تھیں، اسی لیے کوئی مسجد قرآن کریم، اس کی تفسیر اور حدیث شریف وغیرہ کی کتابوں سے خالی نہیں رہتی تھی۔

اور کاتبین وحی قرآن کریم کی جو آیتیں لکھا کرتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خانۂ مبارکہ میں جمع ہو جایا کرتی تھیں، جو بعد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ایک مصحف میں جمع کر کے پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر منتقل کر دی گئیں۔ پھر یہ جمع شدہ قرآن دوسرے خلیفۂ راشد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک منتقل ہو گیا اور ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رہا، تا آں کہ ان سے تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان ذوالنورین نے مستعار لے کر متعدد نقلیں تیار کرائیں، اور ان نقلوں کو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھیج کر اصل نسخہ حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیا۔

اسلامی کتب خانوں کے قیام کا آغاز:

بعض صحابہ وتابعین-رضوان اللہ علیہم اجمعین-اپنے گھروں میں کتابیں جمع کرتے اور ان کو محفوظ رکھتے، جس کو مسلمانوں کے پرائیوٹ کتب خانوں کے نقطۂ آغاز سے تعبیر کرنا چاہئے، چنانچہ

حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ متوفی ۱۴ھ کے پاس ایک یا کئی ایک نوشتے تھے،[۱] جس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ رکھی تھیں؛ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آپ کا مشہور مصحف تھا، جس کی ایک دوسری نقل بھی آپ کے خط سے موجود تھی؛ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متوفی ۵۹ھ کے پاس ایسے بہت سے نوشتے تھے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلم بند تھیں؛ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما متوفی ۶۵ھ تو اپنے نوشتے اور صحیفے ایک صندوق میں بند کر کے رکھا کرتے تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما متوفی ۶۸ھ کے پاس اتنی زیادہ کتابیں تھیں جو ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر تھیں، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما متوفی ۷۳ھ کے پاس بھی متعدد کتابیں تھیں، آپ جب بازار جاتے تو ان کا مطالعہ کیا کرتے تھے، اور حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ متوفی ۹۳ھ کی کتابیں واقعہ حرہ میں جل گئیں، تو آپ کو اس کا بہت غم ہوا۔[۲]

مگر ان خاص خاص کتب خانوں میں چند صحیفوں اور نوشتوں سے زیادہ کوئی چیز نہیں تھی، جس کی ان لوگوں نے حفاظت کی اور ان پر اپنی توجہ صرف کی، اسی طرح ایسے کئی حکام اور مصنفین کا اس طور پر ذکر ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرن اول کے مصنفین میں تھے، لیکن بدقسمتی سے نہ ان کی کتابیں محفوظ رہیں اور نہ ہی کسی کتاب میں نقل کی گئیں، چنانچہ یاقوت نے معجم الادباء میں لکھا ہے کہ علاقہ بن کرسم کلابی - جو یزید بن معاویہ کے زمانے میں - انساب کا عالم تھا، اور ۵۰/اوراق پر مشتمل امثال اس کی ایک کتاب بھی تھی،[۳] اور ابن الندیم نے الفہرست میں لکھا ہے کہ مثالب پر سب سے پہلے جس نے کتاب لکھی وہ زیاد بن ابیہ تھا۔[۴]

تاہم محققین کے نزدیک عہد اسلامی کا سب سے پہلا کتب خانہ، یا بہت سے مؤرخین کے بقول عہد اسلامی کا پہلا پرائیوٹ علمی کتب خانہ دمشق میں قائم کیا گیا، اس کو خالد بن یزید بن معاویہ متوفی ۸۵ھ نے قائم کیا تھا، امویوں اور عباسیوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں یہ کتب خانہ سیاسی انقلاب کی زد میں آ گیا، اور اس کے ذخیرے لوٹ لیے گئے، بعد والوں کے لیے اس

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ: ۷۲/۱
(۲) الطبقات الکبری: ۱۳۳/۵
(۳) معجم الادباء: ۱۹۰/۱۲
(۴) الفہرست: ۱۳۱

کے ذخیرے کی کوئی چیز نہیں رہی، حالانکہ وہ مختلف علوم وفنون کی ایسی تصانیف وتالیفات پر مشتمل تھا، جو کیمیا، طب اور نجوم وغیرہ پر قبطی، یونانی اور سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیے گئے تھے۔

جوزیف ہل اپنی کتاب **الحضارة العربية** میں لکھتا ہے کہ: ''خالد بن یزید بن معاویہ علم کیمیا کا دلدادہ تھا، اس نے ایک راہب سے اس علم کو پڑھا تھا جس نے اس موضوع پر تین کتابیں تصنیف کی تھیں، پہلی کتاب میں اس نے اپنے اساتذہ اور تعلیم کا ذکر کیا تھا''۔(۱)

خالد بن یزید کی طرف بہت سی یونانی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمہ وتعریب اور نقل کا سہرا منسوب کیا جاتا ہے، جس کی نگرانی میں یہ کام انجام پذیر ہوا، جس میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا، جب وہ خلافت کے حصول اور اس کے تخت تک رسائی سے عاجز رہا، تو اس نے اپنی توجہ علم کی طرف منتقل کر دی، اور دوسری زبانوں کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا، ''الفہرست'' کا مصنف لکھتا ہے کہ خالد بن یزید کا نام ''حکیم آل مروان'' پڑ گیا تھا۔

دوسری طرف قرآن کریم کی تدوین کے بعد تدوین حدیث کی تحریک نے اہل علم کی توجہ اپنی طرف ملتفت کر لی، یہ تحریک غیر معمولی توجہ، باریک بینی ودقیقہ رسی اور علمی امانت ودیانت کے اعتبار سے ممتاز تھی، جس میں یہ خواہش کارفرما تھی کہ صحیح احادیث کو جمع کیا جائے اور ان کو موضوع روایتوں سے چھانٹ کر علاحدہ اور الگ کر دیا جائے۔

مسلمان علماء نے اس مقصد کے لیے بحث وتحقیق اور جستجو کے قواعد وضوابط اور طریقۂ کار وضع کیے، جو تاریخی بحث کے طریقۂ کار میں بھی سرفہرست خیال کیے جاتے ہیں، یہ ایک طویل عہد کا نقطۂ آغاز تھا، مسلمانوں کے نزدیک تصنیف وتالیف کے میدان میں یہ طریقہ نہایت عظمت کا حامل تھا، اور اس طریقۂ کار نے بہت تیزی سے پھیل کر دوسرے اسلامی علوم کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، آپ کے غزوات، عربوں اور مسلمانوں کی تاریخ، فتوحات کے واقعات اور انساب عرب وغیرہ۔ پھر اس کا دائرہ زبان وادب اور دیگر علوم وفنون تک وسیع ہو گیا۔

---

(۱) الحضارة العربية: ٧٤

فتوحات حضرت معاویہؓ

تاریخ کی روشنی میں

از: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

[پیش نظر مضمون رسالہ ''دارالعلوم'' اپریل ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا، اس مضمون کا مسودہ بھی بحمداللہ محفوظ تھا، مطبوعہ مضمون میں کئی جگہ غلطیاں تھیں، اور اصل کے مقابلہ میں تقریباً ڈیڑھ صفحے کا نقص تھا، مسودہ سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کے بعد اب دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ادارہ]

اسلامی تاریخ کا یہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ سرکار رسالت پناہ ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے متعدد قبیلے مرتد ہوگئے تھے، اس فتنہ کے استیصال اور مرتدین کی سرکوبی میں سرکار رسالت (ﷺ) کے خلیفہ اولین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جس بے مثال عزم وحزم، اور جس بے نظیر استقلال اور پامردی کا ظہور ہوا، وہ تاریخ کے نوادر میں محفوظ ہے، مجھے اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد اسلامی فتوحات کی راہ میں یہ فتنہ سنگِ گراں بن کر اس طرح حائل ہوگیا تھا، کہ جب تک اس کو راستہ سے ہٹا نہ لیا جاتا۔ اسلامی فتوحات کے آگے بڑھنے کی کوئی صورت ہی ممکن نہ تھی۔

جب صدیق اکبرؓ اس عظیم الشان مہم کو سر کر چکے اور اس فتنہ کی طرف سے ان کو کلی اطمینان ہوگیا، تو انھوں نے ۱۳ھ میں شام پر کئی طرف سے لشکر کشی شروع کی، فتح دمشق کے لئے جو لشکر یزید بن ابی سفیانؓ کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا، اس لشکر کے علمبردار حضرت معاویہؓ تھے۔

(فتوح البلدان، ص۱۱۵)

یزید بن ابی سفیانؓ مدینہ سے چل کر اوزعات پہنچے اور اس کو صلح سے فتح کیا، اس کے بعد عمان کی طرف بڑھے، عمان والوں نے بھی صلح کرلی، اس سے فارغ ہوکر بلقاء پر قبضہ کیا[1]۔ اتنے

(۱) فتوح البلدان ص ۱۳۳

میں جمادی الاخریٰ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ کا سانحۂ وفات پیش آ گیا۔

جب حضرت فاروق اعظمؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو شام کا امیر الامراء مقرر کر کے روانہ کیا، حضرت ابوعبیدہؓ نے شام پہنچ کر حضرت عمروؓ بن العاص کو ایک جمعیت کے ساتھ سواحل اردن کی طرف روانہ کیا، وہاں رومیوں کی بہت بڑی تعداد مقابلہ کے لیے اکٹھی ہوگئی تھی، اور ہرقل نے بھی قسطنطنیہ سے ایک بڑی جماعت مدد کے لیے بھیجی تھی، حضرت عمروؓ نے اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے حضرت ابوعبیدہؓ سے مدد طلب کی، حضرت ابوعبیدہؓ نے یزید بن ابی سفیانؓ کی سرکردگی میں ایک فوج ان کی مدد کے لیے روانہ کی۔ اس فوج کے ہراول کے افسر حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ مدد پہنچنے پر عمروؓ اور یزیدؓ نے رومیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور سواحلِ اردن فتح کر لیے، اس جنگ میں حضرت امیر معاویہؓ نے بڑا کام کیا اور سواحل اردن کی فتح میں ان کا بڑا نمایاں حصہ تھا۔

بلاذری لکھتا ہے:

"وكان لمعاويةؓ في ذلک بلاء حسن وأثر جميل" (فتوح البلدان ص ۱۲۳)

بیروت وغیرہ پر یلغار ان فتوحات کے بعد دمشق کا معرکہ پیش آیا اور دوسرے امراء لشکر کی طرح یزید بن ابی سفیانؓ بھی اپنی ماتحت فوج کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہوگئے۔

۱۴ھ میں حضرت ابوعبیدہؓ کے زیر قیادت دمشق فتح ہو چکا، تو یزید بن ابی سفیانؓ نے بحیرۂ روم کے ساحلی شہروں کی طرف کوچ کیا، اور صیداء، عرقہ، جبیل اور بیروت کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ اس دفعہ بھی ہراول کے افسر حضرت معاویہؓ ہی تھے بلکہ عرقہ کو تو حضرت نے بنفس نفیس فتح کیا۔

حضرت عمرؓ کے آخری زمانہ اور حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور میں رومیوں نے ان شہروں میں سے بعض بعض پر قبضہ کر لیا۔ تو حضرت معاویہؓ نے دوبارہ از سرنو ان کو فتح کر کے قلعوں اور شہروں کی مرمت کرائی، اور ان میں فوجوں کو لا کر بھر دیا۔ (فتوح البلدان ۱۳۳، ۱۳۴)

فتح یافہ اور قیساریہ یافہ فلسطین کی مشہور بندرگاہ ہے، بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ اس کو بھی حضرت معاویہؓ ہی نے فتح کیا۔ ۱۸ھ میں حضرت ابوعبیدہؓ عمواس کے طاعون میں انتقال فرما گئے، اور ان کے انتقال کی خبر دربار خلافت میں پہنچی، تو فاروقِ اعظمؓ نے ان کی جگہ صوبۂ شام کی حکومت اور گورنری کے لیے یزید بن ابی سفیانؓ کو نامزد کیا، اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی بھیجا کہ قیساریہ پر فوج کشی

کریں، قیساریہ بحر روم کے ساحل پر بڑا عظیم الشان شہر تھا، اس کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے شہر پناہ پر ایک لاکھ آدمی ہر رات پہرہ دیا کرتے تھے، اور اس میں تین سو بازار تھے۔

قیساریہ کو فتح کرنے کی فکر میں مسلمان بہت دنوں سے لگے ہوئے تھے، اول اول ۱۳ھ میں حضرت عمروؓ بن العاص نے اس کے محاصرے کی ابتدا کی، لیکن ان کے محاصرہ کی شکل یہ تھی کہ اثناء محاصرے میں جب ان کی یا ان کی فوج کی کسی دوسرے محاذ پر ضرورت پیش آتی تو وہاں سے روانہ ہوجاتے، چنانچہ وہ اسی طرح اجنادین، فحل، دمشق، اور یرموک کی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ ان لڑائیوں سے فارغ ہوکر انھوں نے قیساریہ کا پھر محاصرہ کیا، لیکن چند دنوں کے بعد اس کو چھوڑ کر مصر چلے گئے جب وہ مصر چلے گئے اور یزیدؓ شام کے حاکم مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنے بھائی حضرت معاویہؓ کو اس کے محاصرے کا حکم دیا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ خود یزیدؓ ۱۷ ہزار کی جمعیت لے کر گئے، ایک مختصر سی جنگ کے بعد جب اہل قیساریہ قلعہ بند ہوگئے تو محاصرہ کیا، اثناء محاصرہ میں یزیدؓ بیمار ہوگئے اور حضرت معاویہؓ کو اپنا قائم مقام کرکے دمشق چلے آئے، اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو فتح کیا۔

مولانا شبلی کا بیان | فتح قیساریہ کی کیفیت الفاروق کے مصنف کے الفاظ میں یہ ہے:

''امیر معاویہؓ نے بڑے سروسامان سے محاصرہ کیا، شہر والے کئی دفعہ قلعہ سے نکل کر لڑے لیکن ہر دفعہ شکست اٹھائی، تاہم شہر پر قبضہ نہ ہوسکا، ایک دن ایک یہودی نے جس کا نام یوسف تھا امیر معاویہؓ کے پاس آکر ایک سرنگ کا نشان دیا، جو شہر کے اندر اندر قلعہ کے دروازہ پر گئی تھی۔ چنانچہ چند بہادروں کے ساتھ اس کی راہ قلعہ کے اندر پہنچ کر دروازہ کھول دیا، ساتھ میں تمام فوج ٹوٹ پڑی، اور کشتوں کے پشتے لگادیئے، مؤرخین کا بیان ہے، کم از کم عیسائیوں کی ۸۰ ہزار فوج تھی جس میں زندہ بہت کم بچے، چونکہ ایک مشہور مقام تھا، اس کی فتح سے گویا شام کا مطلع صاف ہوگیا''۔

(الفاروق ص ۸۲)

فتح عسقلان وقبرس | ۱۸ھ کے اخیر میں یزید بن ابی سفیانؓ نے دمشق میں وفات پائی تو ان کی جگہ پر حضرت معاویہؓ کو حضرت عمرؓ نے حاکم شام مقرر فرمایا، اور ان کو فرمان بھیجا کہ فلسطین کے جو مقامات رہ گئے ہیں، ان کو بھی فتح کرلیں، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے عسقلان پر چڑھائی کی، معمولی لڑائی کے بعد دشمن نے صلح کی درخواست کی اور عسقلان مصالحت سے فتح ہوا۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ بار بار

رومیوں سے نبرد آزما ہوئے۔ چنانچہ ۲۵ھ میں رومیوں کو پسپا کرتے ہوئے عموریہ تک پہنچ گئے۔
(تاریخ کامل ص ۲۴)

حضرت معاویہؓ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے کشتیوں کے ذریعہ سمندر کو عبور کر کے سمندر پار اسلامی جھنڈا لہرایا، ان سے پہلے مسلمانوں نے سمندر میں لشکر کشی نہیں کی تھی۔ حضرت معاویہؓ خلافتِ فاروقی ہی میں اس کے لیے مصر تھے، مگر حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت نہیں دی، جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا اور حضرت معاویہؓ نے دریا کے سفر کی آسانیاں ان کے سامنے پیش کیں، یہ بھی بتایا کہ قبرس یہاں سے (حمص سے) بہت نزدیک ہے تو ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ نے ان کو لکھا کہ ''اگر تم اپنی بی بی کو لے کر دریا کا سفر کرنے کو آمادہ ہو تو اجازت ہے، ورنہ نہیں''۔ نیز یہ بھی تاکید کی کہ اس جنگ میں شرکت کے لیے تم خود آدمیوں کا انتخاب نہ کرو، نہ قرعہ اندازی کرو، بلکہ اپنی خوشی سے جو جائے اس کو جہاز پر سوار کر لو اور اس کی اعانت بھی کرو۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے اپنی بی بی فاختہ کو اپنے ساتھ لیا اور عکا سے کشتی پر سوار ہوئے، کشتیاں بہت زیادہ تعداد میں تھیں، صحابۂ کرامؓ میں عبادہ بن الصامتؓ ان کی بی بی ام حرامؓ، ابوایوب انصاریؓ، ابوالدرداءؓ، ابوذر غفاریؓ، فضالہ بن عبیدؓ، عمیر بن سعدؓ، واثلہ بن الاسقعؓ، عبداللہ بن کثیر مازنیؓ، شداد بن اوسؓ، اور حضرت مقدادؓ، اور تابعین میں سے کعب احبارؒ، اور جبیر ابن نفیرؒ، جیسے لوگ ہمرکاب تھے۔

۲۸ھ یا ۲۹ھ میں یہ لشکر روانہ ہوا۔ جب یہ لشکر قبرس پہنچا تو وہاں کے حاکم نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت معاویہؓ نے حسب ذیل شرائط پر اس کی درخواست منظور کی:

۱:- اہل قبرس سات ہزار دوسو دینار سالانہ خراج ادا کریں۔
۲:- رومیوں کی نقل وحرکت کی اطلاع مسلمانوں کو دیتے رہیں۔
۳:- اہل قبرس پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر اہل قبرس کی امداد ضروری نہیں ہے۔
۴:- مسلمانوں کو حق ہوگا کہ اپنے دشمنوں پر فوج کشی کے لیے قبرس کی راہ سے گذریں۔

یہ فتح نہایت عظیم الشان تھی، اور اس میں بہت سارا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اسی جنگ میں حضرت ام حرامؓ کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا۔

فتح شمشاط | حضرت عثمانؓ کے عہد میں امیر معاویہؓ نے آرمینیہ کے شہر شمشاط پر حبیب بن مسلمہ اور

صفوان بن معطل کو لے کر حملہ کیا اور لڑ کر فتح کیا۔ (فتوح البلدان ص۱۷۲)

فتح ملطیہ اس شہر کو پہلے حبیب نے عیاض بن غنم کے حکم سے فتح کیا تھا، لیکن پھر مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، جب حضرت معاویہؓ شام و جزیرے کے حاکم مقرر ہوگئے تو انھوں نے دوبارہ حبیب کو مامور کیا۔

چنانچہ انھوں نے دوبارہ پھر فتح کیا، حضرت معاویہؓ نے وہاں اپنا ایک عامل مقرر کیا اور اس کے ساتھ ایک فوج بھی وہاں تعینات کر دی۔ (فتوح البلدان ص۱۹۳)

فتح افریقیہ افریقیہ کو سب سے پہلے عبداللہ بن سعد نے فتح کیا تھا، لیکن جب ہرقل نے دیکھا کہ افریقیہ کا خراج جو مسلمانوں کے تسلط سے پیشتر دربار قسطنطنیہ میں آیا کرتا تھا بند ہوگیا تو اس نے ایک بطریق کو مامور کیا کہ وہ افریقیہ جائے، اور جس قدر سالانہ رقم مسلمانوں کو دی جاتی ہو اتنی ہی وہ بھی وصول کرے۔

بطریق گیا اور قرطاجنہ میں اہل افریقیہ کو جمع کر کے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

اہل افریقیہ نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، نتیجہ لڑائی اور فتنہ کی صورت میں ظاہر ہوا، بطریق اس میں غالب رہا، اور اس نے وہاں کے حاکم کو نکال دیا، جو فوراً ہی شام چلا آیا۔

اس وقت شام میں حضرت معاویہؓ کی مستقل حکومت تھی، حضرت معاویہؓ سے اس نے سارا قصہ بیان کیا، حضرت معاویہؓ نے معاویہ بن حدیج کو افریقیہ کی مہم پر مامور کیا، اسکندریہ پہنچ کر حاکم افریقیہ مر گیا، معاویہؓ بن حدیج کو اس کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، اور وہ افریقیہ پہنچ گئے، اور ایک جرار لشکر کے ساتھ قمونیہ میں پڑاؤ ڈالا، بطریق نے ان کے مقابلہ پر ۳۰ ہزار جنگی بہادر بھیجے۔

حضرت معاویہؓ کو خبر ملی تو انھوں نے ایک لشکر مدد کے لیے روانہ کیا، اور ایک سخت معرکہ کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی۔

اس کے بعد قلعہ جلولاء کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا، کسی طرح قلعہ کی فصیل منہدم ہوگئی، مسلمان قلعہ میں داخل ہو کر اس پر قابض ہوگئے، اس کے بعد تمام اطراف میں مسلمانوں کی فوجیں پھیل گئیں، اور سب نے اطاعت قبول کر لی۔ جب یہ مہم سر ہوگئی تو حضرت معاویہؓ بن حدیج مصر واپس آ گئے۔

یہ ۴۷ھ اور ۵۰ھ کے درمیان کا واقعہ ہے، ۵۰ھ میں حضرت معاویہؓ نے معاویہ بن حدیج کو

افریقیہ کی حکومت سے معزول کر کے ان کی جگہ پر عقبہ بن نافع کو مقرر فرمایا عقبہ دس ہزار سواروں کی جمعیت لے کر افریقیہ روانہ ہوئے جب وہاں پہنچے تو بربر قوم کے بہت سے لوگ بھی ساتھ ہو لئے، جس کی وجہ سے ان کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اہل افریقیہ کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان امیر آتا تو اس کی اطاعت کر لیتے بلکہ بہت سے دائرۂ اسلام میں بھی داخل ہو جاتے لیکن جہاں وہ امیر واپس ہوتا بدعہدی شروع کر دیتے، اور مرتد ہو جاتے، اس لئے عقبہ نے اچھی طرح سرکوبی کی، اور ساتھ ہی یہ مناسب سمجھا کہ یہاں ایک شہر آباد کر کے فوجی کیمپ قائم کیا جائے اور اس میں کافی تعداد میں مسلمان آباد کیے جائیں، وہاں ان کے اہل وعیال بھی ہوں اور ان کو جائدادیں بھی دی جائیں، تاکہ آئندہ اہل افریقیہ کو شورش پیدا کرنے اور بغاوت پھیلانے کا موقع نہ ملے اس خیال کو عملی جامہ دینے کے لیے انھوں نے ایک زمین کا انتخاب کیا، وہ نہایت گھنا جنگل تھا، سانپ، بچھو، اور ہر قسم کے درندوں کی وہاں نہایت کثرت تھی، عقبہ بہت نیک، اور مستجاب الدعوۃ بزرگ تھے انھوں نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی، اس کے بعد جنگل میں کھڑے ہو کر ایک دفعہ پکار دیا کہ:

اے جنگل کے سانپو اور درندو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور ساتھی ہیں اور اب ہم یہاں قیام کریں گے لہذا تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ، اس کے بعد اگر ہم نے تم میں سے کسی کو یہاں پایا تو جیتا نہ چھوڑیں گے۔

اس اعلان کے بعد لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چوپائے اور درندے اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں، اس واقعہ کا بربر قوم کے بھی بہتیرے افراد نے مشاہدہ کیا، ان پر اس کا ایسا اچھا اثر پڑا کہ وہ مسلمان ہو گئے حضرت عقبہ نے جانوروں کے نکل جانے کے بعد جنگل کے درخت کٹوا کر شہر پناہ کی بنیاد ڈلوائی شہر پناہ کا دور ساڑھے چودہ ہزار ہاتھ تھا، اس کی تیاری کے بعد جامع مسجد بنوائی، اور وہاں آباد ہونے والوں نے اپنے اپنے مکانات اور مختلف مسجدیں بنوائیں تقریباً پانچ برس کی مدت میں یہ ساری چیزیں بن کر تیار ہو گئیں اور شہر آباد ہو گیا۔ یہ شہر سارے عالم میں قیروان کے نام سے مشہور ہے، اس پانچ برس میں حضرت عقبہ اطراف میں برابر فوجیں بھی بھیجتے رہے، چنانچہ نہایت کثرت سے بربری لوگ اس مدت میں مسلمان ہوئے، اور ان کی وجہ سے قیروان میں آباد ہونے والے مسلمانوں کے دل بھی بہت مضبوط ہو گئے، اور اسلام کا قدم خوب اچھی طرح جم

گیا، (کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۸۴)

روڈس ۵۰ھ کے بعد ایک طرف تو افریقیہ میں یہ ہو رہا تھا، دوسری طرف حضرت معاویہ نے جنادہ بن ابی امیہ کو روڈس کی طرف روانہ کیا، یہ جزیرہ نہایت شاداب و زرخیز تھا اور تقریباً ساٹھ میل میں پھیلا ہوا تھا، زیتون، انگور، اور دوسرے میوے بکثرت پیدا ہوتے تھے، پانی نہایت شیریں تھا، جنادہ نے ۵۲ھ میں لڑ کر اس جزیرہ کو فتح کیا، اور حضرت معاویہ کے حکم سے اس میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی آباد کی، حضرت معاویہ نے یہ انتظام بھی کیا تھا، کہ سال بسال باری باری سے مسلمانوں کو وہاں رہنے کے لیے بھیجا کرتے، مشہور تابعی امام حضرت مجاہد بھی وہاں مقیم تھے، (فتوح البلدان ص ۲۴۴) کامل میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو مسلمان روڈس میں رہتے تھے ان کے لیے حضرت معاویہ نے وظیفہ جاری کر رکھا تھا (ص ۱۹۵) روڈس کی فتح نے رومیوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا، روڈس کو فتح کرنے بعد جنادہ نے جزیرہ ارواڈ کو فتح کیا وہاں بھی حضرت معاویہ نے مسلمانوں کو آباد کیا، ارواڈ کی فتح میں حضرت مجاہد بھی شرک تھے، تبیع کو مجاہد نے اسی جزیرہ میں قرآن پاک پڑھایا تھا، ارواڈ قسطنطنیہ کے قریب ہے (فتوح البلدان ج ص ۲۴۴) جنادہ نے جزیرہ کریٹ پر بھی حملہ کیا تھا، مگر فتح نہیں ہوسکا، ولید کے زمانے میں اس کا کچھ حصہ فتح ہوا۔

صقلیہ جزیرۂ سسلی پر (جس کو عرب صقلیہ کہتے ہیں) حضرت معاویہؓ کے عہد میں سب سے پہلی دفعہ حملہ ہوا، حضرت معاویہؓ نے معاویہ بن حدیج کو اس مہم پر مامور فرمایا تھا، اگرچہ اس وقت فتح نہیں ہوا، لیکن معرکہ پیش آیا، اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا، سونے چاندی کے بہت سے بت مال غنیمت میں ہاتھ لگے، حضرت معاویہؓ نے ان کو فروخت کرنے کے لیے ہندوستان بھیجنے کا حکم دیا۔

صقلیہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں فتح نہیں ہوا، لیکن اس کی داغ بیل حضرت معاویہؓ ہی نے ڈالی تھی، اس لیے **من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها** کے اصول سے اس فتح میں ان کا بھی حصہ ہے۔

الغرض اسلامی فتوحات میں حضرت معاویہؓ کا بہت وافر حصہ ہے۔ ان کے کارناموں پر مشتمل ایک مستقل کتاب ''مغازی معاویہؓ'' کا حوالہ فتوح البلدان (ص ۱۷۲) میں موجود ہے۔

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

شمس الدین محمد بن حمزہ فناری آپ سرزمین ٹرکی کے مایۂ ناز عالم تھے، آپ کو امام کبیر اور علامہ نحریر لکھا جاتا ہے، آٹھویں صدی کے آخر میں جو علماء اپنے اپنے فن میں یکتا سمجھے جاتے تھے ان میں ایک وہ بھی تھے، ابن الملقن فقہ و حدیث میں کثرت تصنیفات کے لحاظ سے، صاحب قاموس فن لغت میں، زین الدین عراقی حدیث میں، اور شمس الدین فناری تمام علوم نقلیہ وعقلیہ کی واقفیت میں۔ بروسہ (ٹرکی) کے قاضی تھے، اور سلطان بایزید خاں کے دربار میں ان کی بڑی قدرومنزلت تھی، قاضی شوکانی نے ''البدر الطالع'' میں فناری کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ دینداری میں ایسے ٹھوس، اور فیصلوں میں ایسے منصف وغیر جانبدار تھے، کہ ایک مقدمہ میں انھوں نے سلطان روم کی گواہی اس لیے رد کردی کہ وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتا تھا۔

فناری کی تصنیفات میں فصول البدائع کی بھی شوکانی نے بہت تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ علم اصول فقہ کی جلیل القدر کتابوں میں ہے اور بڑی نافع اور کثیر الفوائد ہے۔

فناری نے پہلی دفعہ ۸۲۲ھ میں حج کیا تھا، اور اس سفر میں خواجہ پارسا کی وفات کے وقت وہ مدینہ منورہ میں تھے، اور انھیں نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

دوسری بار وہ ۸۳۳ھ میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے، شوکانی نے لکھا ہے کہ ان کی بینائی کمزور ہوگئی تھی، جب اس مرض سے اللہ نے ان کو شفا دی، تو شکرانہ میں یہ دوسرا حج کیا، بینائی کے کمزور یا غائب ہوجانے کا سبب کفوی نے یہ بیان کیا ہے، کہ انھوں نے اس بات کی تصدیق کے لیے کہ علماء کا جسم دفن کے بعد بدستور زیر زمین باقی رہتا ہے، اپنے استاد علاء الدین اسود کی قبر کھود کر دیکھا تو ان کو جیسا قبر میں رکھا گیا تھا ویسا ہی موجود پایا، حالانکہ ان کی وفات کو ایک مدت دراز ہوچکی تھی، اس کے بعد ایک غیبی صدا ان کے کانوں میں آئی کہ اب تو تم نے تصدیق حاصل کرلی؟ اللہ تمھیں اندھا کردے، واللہ اعلم

بحقیقۃ الحال۔

دوسرے حج میں انھوں نے انطاکیہ اور دمشق کے راستہ سے سفر کیا تھا، جب قاہرہ پہنچے تو وہاں کے فضلاء وقت ان سے ملے، مذاکرے اور مباحثے بھی کیے، پھر ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا۔

فناری کی وفات ۸۳۴ھ میں ہوئی، سیوطی نے ان کا ذکر بغیۃ الوعاۃ میں اور کفوی نے طبقات حنفیہ میں کیا ہے۔

شیخ کمال الدین ابن الہمام صاحب فتح القدیر محمد بن عبدالواحد نام تھا، اسکندریہ میں پیدا ہوئے، قاہرہ میں تعلیم پائی، اس وقت قاہرہ میں جو جس فن کا سب سے زیادہ ماہر سمجھا جاتا تھا، اس سے اس فن کو حاصل کیا۔

حدیث کی تحصیل جمال حنبلی، شمس شامی، شہاب واسطی اور حافظ ابن حجر سے کی، ہدایہ کامل سراج قارئ الہدایہ سے دو برس میں خوب تحقیق کے ساتھ اس طرح پڑھا کہ خود سراج فرماتے تھے، ابن ہمام نے مجھ سے جتنا استفادہ نہیں کیا اس سے زیادہ مجھ کو فائدہ پہنچایا۔

اصول فقہ میں شرح منار محبّ ابن الشحنہ کے پاس قاہرہ میں پڑھنا شروع کی، جب وہ حلب جانے لگے تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے، تحصیل سے فارغ ہوکر درس وافادہ میں مشغول ہوئے اور تھوڑے دنوں میں ان کے فضل وکمال کی شہرت کا ستارہ چمکنے لگا۔

برہان انباسی ان کے رفیق درس تھے، کسی نے دراندازی کر کے چاہا کہ ان میں اور ابن ہمام میں بگاڑ ہو جائے تو انباسی نے کہا کہ اگر دین کی حجتوں کی تحقیق وتفتیش شروع ہو تو ہمارے شہر میں ابن ہمام کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کو بیان کرنے کا حق ادا کر سکے۔

بساطی اکابر علمائے وقت میں تھے اور وہ ابن الہمام کے استاذ بھی تھے، جب ان سے اور علاء بخاری سے ابن الفارض کے باب میں مناظرہ کی بات چیت ہونے لگی تو کسی نے کہا حکم کون ہوگا؟ بساطی نے کہا ابن الہمام اس قابل ہیں کہ علماء کے درمیان حکم بن سکیں۔

ایک دفعہ بساطی سے دریافت کیا گیا کہ آپ سے کس نے کس نے پڑھا ہے؟ تو انھوں نے قایاتی اور ونائی جیسے اکابر کے نام لینے کے بعد کہا کہ اور ابن ہمام اور وہ تو ان لوگوں کے شیخ واستاد ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ابن الہمام علمی کمالات کے ساتھ خوبصورتی، پاکدامنی، خوش آوازی، فصاحت و بلاغت، نہایت ادب کے ساتھ بحث و مباحثہ، ریاضت اور کرم و بلند حوصلگی میں بھی ضرب المثل تھے۔

پہلی دفعہ جب وہ قبہ منصوریہ میں فقہ کا درس دینے کے لیے بیٹھے تو اس موقع پر اکابر علماء کا اجتماع ہوا، ان کے اساتذہ میں ابن حجر، بساطی قاریٔ الہدایہ اور بدر اقصرائی بھی اس مجمع میں تھے، جب درس کا وقت آیا تو حاضرین کے سخت اصرار کے باوجود وہ اپنے اساتذہ کا احترام کرتے ہوئے صدر مجلس میں نہیں بیٹھے، بلکہ جہاں پڑھنے والا بیٹھتا ہے وہاں بیٹھے اور قرآن پاک کی آیت **یوتی الحکمة من یشاء** پر جو تقریر شروع کی تو علمی مہارت اور وسعت معلومات کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ تمام لوگ ان کا لوہا مان گئے، ابن حجر کی عادت تھی کہ جب کسی کی تقریر طولانی ہو جاتی تو مقرر کی تعریف شروع کر دیتے تاکہ وہ بند کر دے، اس موقع پر بھی انھوں نے مدرس (ابن الہمام) کے علم اور مختلف فنون میں ان کی مہارت کو سراہنا شروع کیا تو بساطی نے کہا ان کی تقریر جاری رہنے دیجئے، وہ ایسا بول رہے ہیں جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

جب وہ شیخونیہ کے شیخ نامزد ہوئے تو اس وقت بھی اپنے فرائض نہایت دیانت و امانت سے انجام دیئے، اس کے اوقاف کو آباد کیا، اس کی آمدنی بڑھائی اور کسی بڑے سے بڑے کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کی۔

سخاوی شافعی نے لکھا ہے کہ **کان إماماً علامة بأصول الدیانة والتفسیر والفقه وأصوله والفرائض والحساب والتصوف والنحو والصرف والمعانی والبیان والبدیع والمنطق والجدل والأدب والموسیقی وجل علم النقل والعقل** یعنی وہ امام تھے اور اصول مذاہب، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، فرائض، حساب، تصوف، نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع، منطق، مناظرہ، ادب، موسیقی اور اکثر عقلی و نقلی علوم کے علامہ تھے، بلکہ لکھا ہے کہ **عالم أهل الارض ومحقق أولی العصر** یعنی وہ روئے زمین کے واحد عالم اور اہل زمانہ میں یکتا محقق تھے۔

ہر چہار مذاہب کے جن جن علماء نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا وہ سب ان کی زندگی ہی میں رئیس العلماء ہو گئے تھے، مثلاً حنفیہ میں تقی شمنی اور قاسم، شافعیہ میں ابن خضر و مناوی، مالکیہ میں عبادہ و قرافی، اور حنبلیہ میں جمال بن ہشام۔

اس علمی جلالت کے ساتھ وہ بہت منصف مزاج، خوش اخلاق، ظرافت پسند، بلند ہمت، بے کینہ، علماء کا احترام ملحوظ رکھنے والے، صالحین کے معتقد اور اہل دولت سے دور رہنے والے تھے۔

سلطان الظاہر جقمق ان کا بڑا معتقد تھا مگر وہ ان کے پاس بھی نہیں جاتے تھے، سلطان یا اس کے وزراء وامراء کو ضرورت ہوتی تھی تو تحریر بھیج کر وہ لوگ دریافت کیا کرتے تھے۔ بلکہ جب ابن الہمام حج کے لیے جانے لگے ہیں تو سلطان نے خود آکر ملاقات کی، انھوں نے بار بار حج کیا اور مدتوں مجاور بھی رہے ہیں، جب انھوں نے چاہ زمزم کے پاس پانی پیا ہے تو اس وقت دین پر ثابت قدم رہنے اور ایمان واسلام پر مرنے کی دعا کی ہے، جیسا کہ انھوں نے خود فتح القدیر میں لکھا ہے، اور مکہ ومدینہ میں بھی انھوں نے علم کی نشر واشاعت کی ہے۔

ابن الہمام نے اوکاوی اور خوافی کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کی ہیں، خوافی کے ساتھ بیت المقدس تک سفر بھی کیا ہے، خوافی نے ان کے حق میں دعا کی تھی کہ حق تعالی ان کو عالم باعمل اور بندۂ صالح بنائے، ۸۶۱ھ میں ان کی وفات ہوئی (ضوءلامع)

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی آپ کا نام احمد بن علی ہے، ۷۷۲ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا، نو برس کی عمر میں قرآن پاک یاد کر لیا۔ اس کے بعد عربیت، فقہ، حساب اور لغت وغیرہ کی تحصیل ان فنون کے ماہر علماء سے کی، اور کمال پیدا کیا، لیکن حدیث کا فن ان کو بہت محبوب تھا، اس لیے ۷۹۶ھ سے بالکلیہ اسی کے ہو رہے، اور حافظ زین الدین عراقی کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

ان سے کامل طور پر استفادہ کرنے کے بعد، شام وحجاز کا سفر کیا اور بکثرت محدثین سے کتب احادیث کی سماعت کی، بلقینی وابن الملقن فقہ میں، عراقی وہیثمی حدیث میں، مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس لغت میں ان کے استاد تھے، فراغ کے بعد درس وافتاء اور تصنیف کے مشاغل میں منہمک ہو گئے۔

ان کی تصنیفات کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے، ان کی تصنیفات کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، خصوصاً بخاری شریف کی شرح فتح الباری تو اس قدر مقبول ہوئی کہ مختلف بلاد کے بادشاہوں نے بھی اس کی خواستگاری کی، اور اس کا ایک نسخہ تقریباً تین سو دینار میں فروخت ہوا۔

حافظ ابن حجر بھی اپنی اس خدمت کو حق تعالیٰ کا بہت بڑا احسان سمجھتے تھے، اس لیے جب اس سے فارغ ہوئے تو خوشی میں ایک شاندار دعوت کی، جس میں پانچ سو دینار صرف ہوئے تھے، اور شاذ و نادر ہی کوئی عالم یا رئیس ہوگا جو اس دعوت میں شریک نہ ہوا ہو۔

حافظ کی تصنیفات کی قدر دانی صرف ان کے شاگردوں ہی نے نہیں کی بلکہ ان کے اساتذہ اور معاصرین نے بھی بہت شوق سے ان کو حاصل کیا۔

ابتدا میں عہدۂ قضاء سے گریز کرتے رہے مگر ۸۲۷ھ میں بقول سخاوی بادل ناخواستہ اس عہدہ کو قبول کیا اور تقریباً ۲۱ برس اس عہدہ پر متمکن رہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کو بہت پریشانیاں اور اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، اس لیے بعد میں ان کو سخت نفرت ہوگئی تھی۔

حافظ نے متعدد مدارس میں تفسیر کا، اسی طرح کئی مدرسوں میں حدیث کا، اور کئی ایک میں فقہ کا درس دیا، اسی کے ساتھ دارالعدل میں افتاء کی خدمت اور جامع ازہر پھر جامع عمرو بن العاص میں خطابت کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

ان کے لیے ایک ہزار بار سے زائد املاء کی مجلسیں منعقد ہوئیں، جن میں اپنی یاد سے انھوں نے علوم و معارف کے دریا بہائے، اکابر علماء ان کی خدمت میں حاضری پر فخر کرتے تھے، لوگوں نے اس کثرت سے ان سے استفادہ کیا کہ ان کے زمانہ میں ہر مذہب کے بڑے بڑے عالم ان کے شاگرد تھے۔

ان کے مشائخ اور معاصرین فن حدیث میں ان کے کمال و رسوخ کے بہت مداح تھے، شاعری میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، ذی الحجہ ۸۵۲ھ میں ان کی وفات ہوئی، ان کے جنازہ میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ بڑے بوڑھوں نے ایسا مجمع کسی جنازہ میں نہیں دیکھا تھا، نماز جنازہ میں خلیفۂ وقت اور بادشاہِ عصر دونوں شریک تھے، اور خلیفہ نے نماز جنازہ پڑھائی تھی، امراء و اکابر نے ان کے جنازہ کو کاندھا دیا، اور وہ لوگ قبرستان تک پیدل چل کر گئے جو اس کی آدھی مسافت بھی کبھی پیدل نہ چلے ہوں گے۔ (الضوء اللامع)

حافظ ابن حجر ایک بار تو کم عمری میں اپنے مربی کے ساتھ مکہ گئے تھے، اور وہاں انھوں نے شافعی مسلک کے مطابق نماز تراویح بھی پڑھائی تھی، اور کتابی تعلیم بھی وہیں شروع کی تھی، پھر جب

حدیث کا شوق ان کو ہوا تو اس علم کی تحصیل کے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے حج کیا، اور آب زمزم پینے کے وقت یہ دعا کی کہ علم حدیث میں ان کو امام ذہبی کا مرتبہ حاصل ہوجائے، تقریباً بیس برس کے بعد پھر حج کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو خود فرماتے ہیں کہ اس وقت اس فن میں میری واقفیت ذہبی سے کچھ زائد ہی محسوس ہوتی تھی، اس لیے میں نے اس دفعہ اس سے اور اونچا مرتبہ حاصل ہونے کی نیت سے آب زمزم پیا۔

اس واقعہ کو ابن الہمام نے فتح القدیر میں خود حافظ کی زبان سے سن کر نقل کیا ہے۔

اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ حافظ کو اس فن میں ایسا کمال حاصل تھا کہ آج بھی ان کو حافظ الدنیا اور خاتمۃ الحفاظ کہا جاتا ہے، اور اس فن کی جو خدمت انھوں نے انجام دی ہے، ان کے بعد ایسی ٹھوس خدمت کم کسی نے انجام دی ہوگی، ان کی فنی خدمتوں کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا، جب کبھی کسی ادارہ کو خدا توفیق دے گا اور ان کی بیش بہا تالیفات: اتحاف المہرہ بالاطراف المبتکرہ[1]، اور المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ[2] اور النکت الظراف علی الاطراف[3] اور تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ[4] وغیرہ منظر عام پر آئیں گی۔

امام بدرالدین عینی شارح بخاری محمود بن احمد نام تھا، اصلاً حلب کے باشندہ تھے، قاہرہ میں قیام تھا، ۷۶۲ھ میں پیدا ہوئے، اوائل عمر میں خود اپنے مولد عنتاب اور حلب میں علوم آلیہ کی تحصیل کی، اور ان میں کمال پیدا کیا۔

سخاوی نے لکھا ہے: **برع في هذه العلوم**، ۷۸۴ھ میں ان کے والد کا انتقال ہوا، اس

(۱) اس کتاب میں حافظ نے، دارمی، ابن خزیمہ (ربع عبادات) ابن الجارود وابوداؤد وابوعوانہ، ابن حبان، حاکم، موطا، شافعی، مسند احمد، شرح معانی الآثار اور دارقطنی کی حدیثوں کی نشاندہی کی ہے، اور ان کے اطراف جمع کئے ہیں، میں نے اس کی تین جلدیں حیدرآباد میں دیکھی ہیں۔

(۲) اس کتاب میں صحاح ستہ کی حدیثوں کے سوا جو حدیثیں مسند طیالسی، مسند مسدد، مسند حمیدی مسند العدنی، مسند ابن ابی شیبہ، مسند احمد بن منیع، مسند عبد بن حمید، مسند حارث بن ابی اسامہ نصف مسند ابن راہویہ اور کچھ مسند ابی یعلی کی حدیثیں حافظ نے یکجا کر دی ہیں۔ اس کا ناقص نسخہ بھی حیدرآباد میں میں نے دیکھا ہے۔ اب اس کے مکمل نسخہ کا فوٹو میرے پاس موجود ہے اور میں نے اس کے محذوف الاسانید نسخہ کو ایڈٹ کرنا بھی شروع کر دیا ہے، ایک جلد مکمل ہوگئی ہے۔

(۳) یہ کتاب اطراف مزی کے ساتھ بھیونڈی میں چھپنا شروع ہوگئی ہے۔

(۴) مصر میں طبع ہوگئی ہے۔

کے بعد انھوں نے حج کیا، اور دمشق آئے، بیت المقدس کی زیارت کی، اور علاء سیرامی فقیہ حنفی کی خدمت میں فقہ کی تحصیل میں لگ گئے، انھیں کے ساتھ پھر قاہرہ آئے، اور برابر ان سے استفادہ کرتے رہے، قاہرہ میں بلقینی، زین الدین عراقی، اور ہیثمی وغیرہم سے فن حدیث حاصل کیا، اور کتب احادیث کی سماعت کی۔

سخاوی نے لکھا ہے کہ وہ امام وعلامہ تھے، تاریخ ولغت کے حافظ تھے، مطالعہ سے تھکتے نہ تھے، انھوں نے اس کثرت سے کتابیں تصنیف کی ہیں کہ اپنے شیخ ابن حجر کے بعد ان سے زیادہ کثیر التصنیف عالم میرے علم میں نہیں ہے، وہ بہت تیز اور اچھا لکھتے تھے، رات بھر میں پوری قدوری لکھ ڈالی تھی، مقریزی کا بیان ہے کہ اسی طرح حاوی بھی ایک رات میں انھوں نے لکھ لی تھی۔

انھوں نے حدیث کا درس دیا، افتاء کی خدمت انجام دی، اور ہر مذہب کے ائمہ نے کئی طبقہ تک ان سے استفادہ کیا، حتی کہ حافظ ابن حجر نے بھی ان سے سن کر چند فوائد قلم بند کئے، بلکہ ان سے تین حدیثوں کی سماعت بھی کی۔

ناچیز کہتا ہے کہ یہ حافظ ابن حجر کی انصاف پسندی کی دلیل ہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ عینی بھی رجال طحاوی لکھنے کے وقت حافظ ابن حجر سے بعض رجال کی نسبت استفسار کیا کرتے تھے، حافظ ابن حجر نے اپنے لڑکے محمد کے لیے بھی عینی سے اجازت حاصل کی تھی۔

سخاوی کہتے ہیں کہ عینی بہت متواضع اور ملنسار تھے، ان کا نام بہت مشہور اور ان کی شہرت دور دور تھی۔

عینی نے جامع ازہر کے قریب اپنے گھر سے متصل ایک مدرسہ بھی بنوایا تھا، اسی میں نماز جمعہ بھی پڑھتے تھے، اس لیے کہ وہ جامع ازہر میں نماز پڑھنے کو صاف صاف مکروہ کہتے تھے، کیونکہ اس کا واقف رافضی اور صحابہ کو برا کہتا تھا۔

وہ بیک وقت قاضی، محتسب اور ناظر احباس تینوں تھے، ان سے پہلے ایک ساتھ یہ تینوں عہدے سخاوی کے خیال میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوئے۔

مدرسہ مؤیدیہ میں حدیث کا درس دیتے تھے، کئی بادشاہوں نے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی، المؤید نے ان کو اپنا سفیر بنا کر بلاد روم (ٹرکی) بھیجا، پھر جب الظاہر ططر بادشاہ ہوا تو اس نے اور زیادہ

ان کا اکرام کیا، اس کے بعد الاشرف برسبائے تو ان کا اتنا گرویدہ ہوا کہ ان سے ان کی تاریخ پڑھوا کر ٹرکی زبان میں اس کا ترجمہ سنا کرتا تھا۔

عینی کو دونوں زبانوں میں مہارت تامہ تھی۔ اس کے علاوہ عینی اس کو امور دین کی تعلیم بھی دیتے تھے، جس سے اشرف کی بہت کچھ اصلاح ہوئی، وہ کہا کرتا تھا کہ عینی نہ ہوتے تو ہمارے اسلام میں خامی رہ جاتی۔

عینی کی تصنیفات میں عمدۃ القاری شرح بخاری، حافظ ابن حجر کی شرح کی طرح علماء میں مقبول ومتداول ہے، اور ہر چند کہ خوردہ گیر مصنفین یہ نکتہ چینی کرتے ہیں کہ عینی نے بہت سے مطالب فتح الباری سے لیے ہیں مگر اس سے عینی کے فضل وکمال اور ان کی وسعت معلومات پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔

عینی کا یہی ایک علمی کارنامہ نہیں ہے، اس کے علاوہ بنایہ شرح ہدایہ، اور شرح معانی الآثار کی دو شرحیں مبانی الاخبار، اور نخب الافکار وغیرہ بھی ان کے علمی شاہکار ہیں، خوردہ گیروں کو بتانا چاہئے کہ ان کی یہ تصنیفات کن کتابوں کا چربہ ہیں، بنایہ تو ہندوستان میں طبع ہوچکی ہے، اور معانی الآثار کی دونوں شرحیں اگر چہ اب تک چھپی نہیں ہیں مگر ہندوستان میں ان دونوں کے ناقص قلمی نسخے موجود ہیں، ان کو پڑھئے تو آپ کو عینی کی علمی عظمت کا اندازہ ہوگا، امام عینی نے ایک حج تو ۷۸۸ھ سے پہلے کیا ہے، دوسرا حج انھوں نے ۷۹۹ھ میں کیا، ذی الحجہ ۸۵۵ھ میں وفات پائی۔

شیخ الاسلام سعد الدین دیری حنفی سعد بن محمد نام تھا، حافظ ابن حجر اور عینی کے معاصر تھے، سخاوی نے ان کا ذکر ذکر **العالم الکبیر وحامل لواء التفسیر** کے عنوان سے کیا ہے، ۷۶۸ھ میں پیدا ہوئے، حافظہ نہایت قوی تھا، قرآن پاک کے علاوہ کنز وغیرہ کئی کتابیں زبانی یاد تھیں، قاضی عیاض کی مشارق کا اکثر حصہ بارہ دن میں یاد کرڈالا تھا، فقہ میں حافظ الدین بزازی اور قونوی کے، اور حدیث میں اپنے وقت کے مشہور محدثین ابن المہندس، ابوالخیر بن العلائی اور صدر یاسوفی وغیرہم کے شاگرد تھے۔

سخاوی کا بیان ہے کہ وہ امام علامہ تھے، نہایت قوی الحافظہ، اور مسائل کے استحضار میں پہاڑ تھے، مناظرہ میں کوئی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تھا، اس قدر حدیثیں برزبان تھیں کہ بیان سے

باہر،فصاحت وروانی تقریر کا بھی یہی حال تھا،امراء وسلاطین اور خواص وعوام سب کے دلوں میں ان کا بے حد احترام اور سب کی نگاہوں میں ان کی بڑی عظمت تھی۔

یہاں تک کہ ایک دفعہ ابن الہمام، اور امین اقصرائی سے ان کی جگہ پر منصب قضا قبول کرنے کو کہا گیا تو دونوں نے یہ جواب دیا کہ شیخ سعدالدین کی موجودگی میں یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

ایک دفعہ ابن الہمام سفر حج سے واپس آئے تو گھر جانے سے پہلے مدرسہ مؤیدیہ میں شیخ سعدالدین کو سلام کرنے حاضر ہوئے، حافظ ابن حجر ان کی تعظیم واکرام، اور ان کے محاسن کا اعتراف کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔

سخاوی کہتے ہیں کہ اس باب میں ان کا معاملہ حیرت انگیز تھا، اسی طرح شیخ سعدالدین بھی ابن حجر کی وفات کے بعد اپنی تنہائی کو بری طرح محسوس کرتے تھے۔

سعدالدین کے فضل وکمال کا شہرہ دور دور تک تھا، چنانچہ بادشاہ مصر الظاہر جقمق کا قاصد سمرقند کے بادشاہ شاہ رخ کے پاس گیا تو اس نے چند علماء کی خیریت پوچھی جن میں ایک سعدالدین بھی تھے، جب قاصد نے بتایا کہ یہ سب لوگ زندہ مع الخیر ہیں، تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور شکر خدا بجالایا۔

ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی، اور ہر مذہب کے فضلاء ان کی شاگردی پر ناز کرتے تھے، تمام ملکوں سے ان کے پاس فتویٰ آتے تھے۔

شیخ سعدالدین نے پہلا حج ۷۸۸ھ میں کیا تھا، اس کے بعد پھر کئی حج کیے۔

ان کا بیان ہے کہ میں جب ۷۹۷ھ میں حج کو جانے لگا تو شیخ ابوبکر موصلی کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوا، شیخ نے مجھے دعا دے کر رخصت کیا، اس موقع پر میرے والد نے تاکید کی تھی کہ جب کسی منزل پر قیام کی نوبت آئے تو قافلہ کے بیچ میں قیام کرنا۔

چنانچہ میں اس کا برابر خیال رکھتا تھا، مگر ہوتا یہ تھا کہ جو لوگ ہمارے دائیں بائیں ہوتے تھے وہ منتقل ہوجاتے تھے، اور ہم کنارے پڑ جاتے تھے، صرف عرفات میں ہم بیچ میں رہ سکے، بایں ہمہ ہماری کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی، اور ہم ہر طرح محفوظ رہے، صرف ایک چاقو جسے راستہ میں، میں نے خریدا تھا گم ہوگیا مگر اس کی نسبت میرے دل میں کھٹک تھی کہ وہ مال مشتبہ تھا۔

بہر حال مجھے اس پر بڑا تعجب تھا کہ ہمارے آس پاس سے لوگ کیوں منتقل ہو جاتے ہیں، اور ہم کیوں کنارے پڑ جاتے ہیں، تا آنکہ غزہ میں ایک بوڑھے شتر بان سے میری ملاقات ہوئی، جو علم تصوف کی بہت عمدہ باتیں کرتا تھا، مجھے اس کی ظاہری حالت کی بنا پر بڑا تعجب ہوا، لیکن میرا یہ تعجب بہت جلد زائل ہو گیا، جب اس نے بتایا کہ وہ بہت سے مشائخ تصوف کی صحبت میں رہا ہے، ازانجملہ شیخ ابوبکر موصلی تھے، انھوں نے اس کے اونٹ پر سفر حج کیا تھا، پھر اس نے کہا کہ وہ مجھے برابر تاکید کرتے تھے کہ منزل پر کنارے قیام کیا کروں، اس لیے کہ اس میں اچھی راحت رہتی ہے، اور قضائے حاجت وغیرہ میں آسانی ہوتی ہے۔

باقی رہی حفاظت، تو محفوظ وہی رہتا ہے جس کو خدا محفوظ رکھے، جب یہ بات میں نے شتر بان سے سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں جو کوشش کے باوجود ہر منزل میں کنارے پڑ جاتا ہوں، یہ ابوبکر موصلی کا باطنی تصرف ہے۔

شیخ سعدالدین دیری کی وفات ۸۶۷ھ میں ہوئی، ان کے جنازہ میں بادشاہ وقت اور تمام قضاۃ وامراء واعیان شریک تھے، (ضوء لامع، فوائد بہیہ، شذرات)

افادہ: – شیخ ابوبکر موصلی آٹھویں صدی کے اکابر اولیاء میں تھے، علم وعمل کے جامع تھے، بڑے بڑے ائمہ اعلام ان کے فیض یافتہ اور معتقد تھے، ابن رسلان جیسے محدث وفقیہ نے ان کے ہاتھ سے خرقہ پہنا تھا، اور سعدالدین دیری جیسے جلیل القدر علامہ ان سے دعا لینے جاتے تھے۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ بہت بڑے بڑے لوگ جیسے شہاب زہری اور شمس الدین صرخدی ان کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے۔

کپڑا بننا ان کا ذریعۂ معاش تھا، اور انھوں نے بکثرت حج کیے تھے، الملک الظاہر ان کے حجرہ میں ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوا، اور اپنی شاہانہ حیثیت کے مطابق بہت بڑی رقم نذرانہ میں پیش کی، مگر شیخ موصلی نے ایک پیسہ بھی قبول نہیں کیا۔

شیخ کی وفات ۷۹۷ھ میں ہوئی، آپ کا مزار قدس میں ہے، آٹھویں صدی میں آپ کا تذکرہ بھول سے رہ گیا، اب مذکورہ بالا واقعہ کی مناسبت سے یہ مختصر تذکرہ زینت بخش کتاب ہو رہا ہے۔

ماخوذ از ماہنامہ البدر کاکوری

عجیب وغریب عنبر

(مولانا) معاویہ عبدالرحیم فاروقی

تاریخ کا طالب علم ہرطرح کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، دوران مطالعہ اگر ایک طرف سلف صالحین کی محنت شاقہ، ان کی جہد مسلسل، ان کی جفاکشی وفاقہ کشی کے عبرت انگیز واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں کہ جن سے اس کی روح کو تازگی اور اس کے عزم کو ایک نیا جوش وولولہ ہاتھ آتا ہے، تو دوسری طرف بسا اوقات ایسے عجیب وغریب اور عقل کو حیران کر دینے والے واقعات بھی اس کے سامنے صفحۂ قرطاس پر رونما ہوتے ہیں کہ پہلی فرصت میں تو عقل ان کا انکار ہی کر دیتی ہے، لیکن چونکہ ان واقعات کی اکثریت ایسے معتبر افراد سے منتقل ہوکر اس تک پہنچتی ہے کہ ان میں کا ہر ایک ایسی جگہ میزان اعتبار ہوتا ہے۔ بالآخر خواہی نا خواہی قبول کرنا ہی پڑتا ہے، پھر ایسے واقعات کی تعداد صرف تاریخ اسلام ہی میں اس قدر ہے کہ اگر ان کو ایک جگہ مرتب کیا جائے تو وہ ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرلیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کا ایک حقیقی لیکن عجیب وغریب واقعہ پیش خدمت ہے۔

امام بخاری وامام مسلم اپنی اپنی کتاب یعنی صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کے تعلق سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، جس کو خود حضرت جابرؓ اپنی زبانی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں ایک لشکر قریش سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا، جس میں میں بھی شامل تھا، بطور زادراہ ایک تھیلا کھجور کا آپ نے ساتھ کر دیا۔ چونکہ اس کے سوا دوسری چیز کوئی نہیں تھی، اس لیے حضرت ابوعبیدہؓ ایک ایک کھجور ہی ہر ایک ساتھی کو تقسیم کر پاتے، حضرت جابرؓ کے بیان کرنے کے دوران ہی ایک سائل سوال کرتا ہے، حضرت! یہ بتائیے کہ ایک کھجور میں آپ لوگوں کا گذارہ کیسے ہوتا تھا؟ ہم اس کو بچوں کی طرح چوستے رہتے تھے حضرت جابرؓ نے جواب دیا، پھر جب وہ ختم ہوجاتی تو پانی پیتے اور یہی رات تک کا کھانا ہوتا،

اسی طرح رات میں ایک کھجور ملتی، بسا اوقات شدت بھوک سے مجبور ہو کر ہم درخت کے پتے توڑتے، پھر ان کو پانی میں نرم کر کے کھاتے۔۔۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہم لوگ ساحل سمندر پر تھے کہ اچانک ہماری نظر ایک ایسی شئ پر جا پڑی جو ریت کے بڑے اور اونچے ٹیلہ کی طرح معلوم ہوتی تھی، چنانچہ جب شوق جستجو کی تکمیل کے لیے ہم اس کے قریب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ تو ایک سمندری جانور ہے جسے عنبر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آگے حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں چونکہ ہم بھوک سے نڈھال تھے اور یہ بھوک اللہ کے راستے میں پیش آئی تھی، اس لیے امیر کے حکم سے ہم لوگوں نے اس کو کھانے کے لائق سمجھا، تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم اس کو مسلسل دن و رات ملا کر ایک مہینہ تک کھاتے رہے جب کہ ہمارے لشکر کی تعداد تین سو پر مشتمل تھی، اسی عجیب وغریب سمندری جانور عنبر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: اس کی آنکھوں کی تری کو ہم بطور تیل استعمال کرتے، جس کو بڑے بڑے مٹکوں سے نکالا جاتا، پھر بیل کے برابر برابر اس کے ٹکڑے کرتے، پھر اس کو پکا کر کھاتے، مزید تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس جانور کی صرف آنکھ کی لمبائی و چوڑائی اس قدر تھی کہ امیر حضرت ابوعبیدہؓ نے ہم میں سے تیرہ آدمیوں کو اس کے اندر بیٹھایا تو وہ آسانی سے اس کے اندر سما گئے، پھر اس کی ایک پسلی کھڑی کی اور ہم میں سے جو سب سے لمبا شخص تھا اس کو ہمارے سامنے سب سے اونچے اونٹ پر بیٹھا کر اس کی پسلی کے نیچے سے گزرنے کا حکم دیا تو وہ آسانی سے گذر گیا۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں: اس کے کچھ ٹکڑے بچ گئے تھے جب ہم مدینہ آئے تو ان کو ساتھ لائے اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری روداد کہہ سنائی، آپ نے سن کر فرمایا: یہ اللہ رب العزت نے خاص تم لوگوں کے لیے رزق اتارا تھا، کیا اس میں سے کچھ بچا ہے؟ چنانچہ ہم نے بچا ہوا آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اس کو تناول فرمایا۔

(ترجمہ: از صفحات من صبر العلماء علی شدائد العلم والتحصیل، صفحہ ۳۳-۳۴)

استاذ گرامی حضرت مولانا زین العابدین صاحب معروفی علیہ الرحمہ

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

میری طالب علمی کا آغاز تھا ۱۹۶۴ء میں اس بندہ نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں، عربی دوم کے درجہ میں داخلہ کا شرف پایا تھا، اس وقت مدرسہ کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا، مولانا عبدالباری صاحب علیہ الرحمہ ایک مقبول ومحبوب منتظم تھے، نہ صرف مدرسہ کے بلکہ اس علاقے کے مشہور ومسلّم اور با اثر قائد وزعیم تھے، ان کے انتظام میں مدرسہ میں اس وقت اچھے اور باکمال اساتذہ کا ایک دلکش مجمع تھا ،حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا محمد یحیی صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا عبد المنان صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا شمس الدین صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ، یہ عربی درجات کے گرانمایہ اساتذہ کا وہ مجمع تھا جو ہر ایک بجائے خود علم وفضل کا آفتاب و ماہتاب تھا، اس مجمع علماء میں، اس نورانی کہکشاں میں، ایک نمایاں اور ممتاز، روشنی سے معمور ذات حضرت مولانا زین العابدین صاحب کی تھی، ہلکا پھلکا بدن، رنگ صاف، چہرے پر چیچک کے داغ، چیچک کی بیماری میں ایک آنکھ چلی گئی تھی، شرعی کرتا، شرعی پاجامہ، سر پر عمامہ، رفتار تیز، گفتار سنجیدہ، مزاج میں متانت کے ساتھ قدرے تیزی، نہایت صالح اور ذاکر وشاغل ،طلبہ پر ان کا رعب داب قائم، ذہانت وحافظہ کے پیکر، ان کی علمیت وقابلیت کے سب معترف تھے، لیکن سبق پڑھانے میں الفاظ جچے تلے اور مختصر استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض طلبہ کو سمجھنے میں تنگی محسوس ہوتی تھی، مگر مولانا اپنے رنگ میں فرد تھے، ہر کتاب بخوبی پڑھا سکتے تھے اور پڑھاتے تھے، جو کتابیں مشکل ہوتیں ان کے اسباق خاص طور سے ان کے پاس جاتے اور وہ کامیابی کے ساتھ پڑھاتے، کبھی کبھی طلبہ کی طرف سے الجھنیں بھی پیش آتیں مگر مولانا کامیاب رہتے۔

میں عربی دوم میں داخل ہوا تھا، اس سال ہماری جماعت کی کوئی کتاب مولانا کے یہاں

درس میں نہ تھی، میں دور کا تماشائی تھا، مولانا اپنے معمولات، درس کی ذمہ داریوں، درسگاہ کی حاضری اور اسباق کے بلا ناغہ پڑھانے کے نہایت پابند تھے، ساتھ ہی اسباق کے مطالعہ کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے، ابتدائی درجات کی وہ کتابیں جنہیں زبانی یاد کرنا ضروری ہوتا انھیں بڑی توجہ اور اہتمام سے یاد کراتے اور فرداً فرداً ہر طالب علم سے سنتے تھے، اور اس میں کسی طرح کا تساہل برداشت نہ کرتے، میں دیکھا کرتا تھا کہ عربی اول کے طلبہ نحو میر کو بہت محنت سے زبانی یاد کیا کرتے تھے، یہ کتاب مولانا کے پاس تھی، انھوں نے حرفاً حرفاً یہ کتاب متن اور ترجمہ کے ساتھ اس طرح یاد کرادی تھی کہ جب چاہتے ان سے سن لیتے، یہ طریقہ درس تھا تو بہت محنت کا مگر فن کے مسائل ذہن میں پھر آخر تک مستحضر ہوجاتے اور آئندہ تعلیمی دور میں سہولت بڑھتی رہتی۔

میں دیکھتا تھا کہ طلبہ مولانا سے بہت ڈرتے تھے اور اسکی وجہ سے ان کے زیر درس کتابوں میں عام کتابوں سے زیادہ محنت کرتے تھے، اس کے ساتھ مولانا طلبہ پر شفیق بھی بہت تھے، وہ طلبہ جو محنت کرتے اور سلیقہ مند ہوتے مولانا کی نظر میں بہت قابل توجہ ہوتے اور ان پر عنایتیں فرماتے، لیکن سست، کاہل، کام چور طلبہ سے مولانا کو کوئی مناسبت نہ ہوتی، اس لئے مولانا کے پاس طلبہ کو بہت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔

اس وقت چند خوبیاں مولانا کی طلبہ کے درمیان بہت معروف تھیں اور یہ خوبیاں مولانا کی زندگی کے ہر مرحلے میں یکساں طور سے دائر رہیں۔

مولانا کے بارے میں طلبہ کے درمیان اس وقت تک یہ بات معروف تھی کہ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے امتحان میں مولانا کو پہلی پوزیشن حاصل ہوئی تھی، اس وقت اعظم گڑھ کے دو طلبہ کو یہ اعزاز ملا تھا، ایک تو جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے بانی اور سابق ناظم حضرت مولانا شکر اللہ صاحب علیہ الرحمہ کو، دوسرے ہمارے مولانا زین العابدین صاحب معروفی علیہ الرحمہ کو، جو جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے سابق طالب علم اور موجودہ استاذ تھے۔

مولانا اس درجہ ذہانت، فطانت کے ساتھ ابتدا ہی سے نہایت بے نفس اور پاک طینت تھے، جس طالب علم کی دارالعلوم دیوبند کے سب سے اہم امتحان میں یہ پوزیشن آئی ہو، ظاہر ہے کہ وہ اپنے رتبہ اور پوزیشن کے مطابق جگہ اور خدمت کا طالب ہوگا اور کسی کم درجہ کی خدمت یا تدریس پر راضی نہ ہوگا، مگر مولانا کا حال یہ تھا کہ اتنے اونچے درجہ سے کامیاب ہونے کے بعد بزرگوں اور سرپرستوں نے ایک گاؤں کے مکتب میں ضرورت محسوس کی، مولانا کو حکم دیا اور مولانا بے تکلف وہاں قاعدہ

بغدادی اور ابتدائی دینیات پڑھانے بیٹھ گئے۔

میں اس وقت جہاں مدرس ہوں یعنی شیخو پور، ایک بار مولانا تشریف لائے اور میں مولانا کے ساتھ کہیں جا رہا تھا، شیخو پور سے دو کلو میٹر مشرق میں ایک گاؤں، چھوٹا سا گاؤں خالص پور ہے وہاں سے گزر ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ میرے پڑھانے کا آغاز اسی گاؤں سے ہوا ہے، یہاں میں بچوں کو قاعدہ بغدادی اور ناظرہ قرآن کریم پڑھایا کرتا تھا، مجھے یہ یاد نہیں کہ کتنے دنوں مولانا نے یہاں پڑھایا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مولانا نے قاعدہ بغدادی سے بخاری شریف تک درس نظامی کی تمام کتابیں پڑھائی ہیں نہ کسی کتاب کی تدریس کو اپنے لئے عار سمجھا اور نہ کسی کتاب کے پڑھانے پر فخر کیا، بس ایک بات ہمیشہ پیش نظر رہی کہ دین کی خدمت ہو اللہ راضی ہو اسی جذبہ سے مدارس میں رہے، اسی جذبہ سے تبلیغی اسفار کئے پیدل بھی اور سواری سے بھی۔

حضرت مولانا دارالعلوم دیو بند سے ۱۳۷۱ھ میں فارغ ہوئے تھے، اس وقت دارالعلوم دیو بند میں ایک سے بڑھ کر ایک علماء و مشائخ کا مجمع تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کی سرپرستی میں علم و فضل کا یہ قافلہ تعلیم و تربیت کی بہاریں لئے آگے بڑھ رہا تھا، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی شیخ المعقول وغیرہ اکابر، علم دین کا نور برسا رہے تھے، مولانا نے ان بزرگوں سے اکتساب فیض کیا۔

مولانا قرآن بہت عمدہ پڑھتے تھے، حافظ نہ تھے مگر جید قاری تھے اور قرآن کی بڑی بڑی سورتیں جن کا نمازوں میں پڑھنا مسنون تھا مولانا کو خوب یاد تھیں، اس خوبی کا یہ اثر تھا کہ مدرسہ کے قریب جامع مسجد میں جس کا انتظام مدرسہ ہی کے تحت تھا زیادہ تر نماز مولانا ہی پڑھایا کرتے تھے اس وقت مدرسہ کے ما تحت دو مسجدیں تھیں، ایک چھوٹی مسجد جو مدرسہ کے بالکل متصل ہے، دوسری جامع مسجد جو مدرسہ سے دو تین منٹ کے فاصلہ پر ہے، ان دونوں مسجدوں میں اس وقت تنخواہ دار امام متعین نہ تھے، علماء و طلبہ کا مجمع موجود رہتا تھا، امام کے انتخاب میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی، چھوٹی مسجد میں امامت بالعموم مدرسہ کے صدر المدرسین استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب فرمایا کرتے تھے، مفتی صاحب نیکی و تقوی، وقت کی پابندی میں اللہ کی ایک نشانی تھے، جامع مسجد میں امامت عموماً مولانا زین العابدین صاحب کرتے وہ نہ ہوتے تو درجہ حفظ کے استاذ حافظ محمد یسین صاحب علیہ الرحمہ یا کوئی طالب علم کرتا۔

مولانا کی قرأت کا ایک خاص انداز تھا، جو آج تقریباً ۴۸/۴۹ سال گزرنے کے بعد بھی

ذہن اور حافظہ میں موجود ہے، مولانا نماز میں مسنون قرأت کا اہتمام کرتے تھے، فجر کی نماز میں طوال مفصل کی پوری سورتیں پڑھتے تھے، عشاء کی نماز میں اوساط مفصل کی مکمل سورہ پڑھتے، درمیان درمیان سے پڑھنے کی عادت نہ تھی، ظہر اور عصر میں بھی مسنون سورتوں کی پابندی کرتے تھے، بعد میں مولانا نے اس موضوع پر قرأت مسنونہ کے نام سے ایک مفید رسالہ بھی لکھا، مولانا سنتوں پر بہت اہتمام کے ساتھ عمل کرتے تھے۔

تجوید و قرأت کی تعلیم مولانا نے اپنے ہم وطن استاذ کامل، امام المجودین والقراء قاری ظہیر الدین صاحب معروفی علیہ الرحمہ سے حاصل کی تھی اور اس فن میں کمال حاصل کرلیا تھا، مجھے یاد ہے کہ مولانا کے یہاں ہم لوگ مقامات حریری کا سبق پڑھنے ایک روز بیٹھے تھے کہ مدرسہ میں خبر گرم ہوئی کہ قاری ظہیر الدین صاحب تشریف لا رہے ہیں، قاری صاحب عرصہ تک مدرسہ میں تجوید و قرأت کے استاذ رہ چکے تھے، میں جب مدرسہ میں حاضر ہوا تو قاری صاحب اپنے وطن پورہ معروف میں مشغول فیضان تھے، مولانا اپنے استاذ کے آنے کی خبر سن کر بہت مسرور تھے، اس وقت ان کے چہرے کا رنگ، ان کا انداز تواضع و خدمت دیدنی تھا، ہم لوگ خوش تھے کہ مولانا کے ایسے اہم اور معزز استاذ آرہے ہیں، آج خاطر، تواضع اور ادب و خدمت گزاری میں سبق کی چھٹی ہو جائے گی، مولانا کے یہاں سبق کا ناغہ کبھی نہ ہوتا تھا، قاری صاحب آئے، کس ادب و انکساری کے ساتھ مولانا نے ان کا استقبال کیا اور کتنے احترام و نیازمندی کے ساتھ انھیں بیٹھایا اور انداز تشکر سے ان کی ضیافت کا اہتمام کیا آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے روشن ہے، قاری صاحب کا دلنواز برتاؤ، ان کا دلآویز اور شیریں انداز گفتگو ہم لوگوں کے دلوں میں اترتا جارہا تھا، ہم تھوڑی دیر کے لئے ایسی فضا میں پہونچ گئے تھے جہاں اطمینان ہی اطمینان تھا خنکی ہی خنکی تھی، دلنوازی و محبت کی خوشبو میں پورا ماحول بسا ہوا تھا، کچھ دیر گزرنے بعد مولانا نے استاذ محترم سے بغایت ادب سبق پڑھانے کی اجازت چاہی، محبت و عقیدت کی اس فضا میں ہم لوگوں کی نیازمندی نے ناز کا رنگ اختیار کرلیا تھا، ساتھیوں نے عرض کیا، حضرت جو سلسلہ چل رہا ہے چلنے دیجئے سبق تو روز پڑھنا ہی ہے لیکن مولانا ادب سے اسی طرح سمٹے ہوئے ہم لوگوں کی کہی ان سنی کر کے اور قاری صاحب کی صراحۃً اجازت بلکہ حکم پاکر پڑھانے میں مشغول ہو گئے، تھوڑا سبق ہوا مگر ناغہ نہیں ہونے دیا۔

مولانا نماز باجماعت کے بہت پابند تھے، اس وقت یہ خوبی حضرات اساتذہ میں ایسی نہ تھی جس سے کسی کو امتیاز ہوتا کیونکہ سبھی اساتذہ نماز باجماعت کا بہت اہتمام کرتے تھے، ہم طالب علموں

کی کسی استاذ پر انگلی نہ اٹھتی تھی کہ فلاں نماز با جماعت میں سستی کرتے ہیں، مولانا کو جو امتیاز حاصل تھا وہ یہ کہ مولانا نماز بہت عمدہ پڑھاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ذکر وشغل کے بہت پابند ہیں، سب جانتے تھے کہ مولانا کو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سے بہت وابستگی ہے، مولانا صبح و شام ذکر جہر کی پابندی کرتے تھے، اس وقت ذکر جہر کا اہتمام کرنے والا مولانا کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، ہاں کبھی کبھی مولانا شمس الدین صاحب علیہ الرحمہ کے ذکر جہر کی بھی آواز سنائی دیتی تھی۔

مولانا پابندی کے ساتھ عمامہ کی سنت کا بھی اہتمام کرتے تھے، مدرسہ میں اس کا اہتمام حضرت مفتی محمد یسین صاحب علیہ الرحمہ کرتے تھے اور ان کے بعد مولانا زین العابدین صاحب!

مولانا ایک روز سبق میں مشغول تھے، میں ابھی تازہ مدرسہ میں حاضر ہوا تھا، بارہ سال عمر تھی دبلا پتلا، پیلا بے وقعت! کھڑکی کے پاس کھڑا مولانا کا درس سننے لگا، مولانا نے شفقت سے درس گاہ میں بلایا، میں ڈرتا ہوا حاضر ہوا، انھوں نام اور وطن پوچھا اور یہ کہ کیا پڑھتے ہو؟ میں نے بتایا پھر نہایت نرم لہجے میں فرمایا کہ مٹی نہ کھایا کرو، میں نے عرض کیا کہ میں مٹی نہیں کھاتا، انھوں نے فرمایا کہ چہرے پر زردی ہے اس لئے خیال ہوا کہ شاید مٹی کھاتے ہو، میں نے شدومد سے مٹی کھانے کی نفی کی مگر چند ہی دنوں میں ظاہر ہوا کہ مجھ پر یرقان کا شدید حملہ ہو رہا ہے، اس کی وجہ سے میں مہینوں صاحب فراش رہا۔

عربی دوم اور عربی سوم کے درجات میں مولانا کے پاس میری جماعت کا کوئی سبق نہ تھا، ہم لوگ بس دور سے زیارت کر لیا کرتے تھے، عربی چہارم میں آئے تو مولانا کی خدمت میں دو سبق پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ترجمہ کلام اللہ شریف نصف اخیر مکمل اس سال مولانا کے درس میں پڑھنا تھا، مولانا نے نہایت خوبی سے پندرہ پارے کا ترجمہ ضروری تفسیر وتشریح کے ساتھ پڑھایا، مولانا نے اس کا اہتمام کیا کہ صحیح صحیح ترجمہ یاد ہو جائے، جنچا تلا ترجمہ بتاتے اور اسے یاد کراتے، ہلکی پھلکی تشریح جو یاد ہو جائے، کرتے پھر اسے بھی یاد کرا دیتے۔

دوسرا سبق مقامات حریری کا تھا، مفردات کا ترجمہ، مادہ، صیغہ وغیرہ لکھواتے، آسان اور مطلب خیز لفظی ترجمہ کراتے، اپنے دستور کے مطابق انھوں نے اتنے اہتمام سے دونوں سبق پڑھائے کہ بغیر کسی دقت کے اور بغیر خارجی وقت کا سہارا لئے اور بغیر درس کی مقدار بڑھائے سالانہ امتحان سے پہلے، دونوں اسباق اختتام تک پہونچا دیے۔

اس سال میرے متعلق حضرت مولانا کا ایک خاص معاملہ ایسا ہوا جس سے مولانا کی وسعت

ظرف، ان کی خوردنوازی اوران کی مہربانی وشفقت کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔

ایک روز میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا، ایک طالب علم جو عمر میں اور درجہ میں مجھ سے بڑے تھے کمرے میں آئے اور میرا نام لے کر مجھے دریافت کرنے لگے، میں متوجہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ مجھے ترجمہ کلام پاک اور مقامات حریری پڑھا دیجئے، میں اپنے نیچے درجے والے بعض طلبہ کو پڑھایا کرتا تھا لیکن یہ تو عربی پنجم کے طالب علم تھے اور میں چہارم کا، میں سوچنے لگا کہ یہ الٹی گنگا کیونکر بہے گی، میں نے معذرت کی آپ پنجم کے طالب علم ہیں اور میں چہارم میں پڑھتا ہوں، میں آپ سے پڑھونگا نہ کہ آپ مجھ سے!

کہنے لگے میرا امتحان داخلہ مولانا زین العابدین صاحب نے لیا تھا، عربی چہارم کی سب کتابوں میں تو کامیاب تھا، لیکن ترجمہ کلام پاک نصف اخیر اور مقامات حریری کے اسباق میں نے پڑھے ہی نہ تھے مولانا نے فرمایا کہ تمہاری استعداد عربی پنجم کے لائق ہے اور عمر بھی زیادہ ہو رہی ہے، مگر یہ دونوں کتابیں رہی جارہی ہیں، میں نے عرض کیا کہ میرا داخلہ عربی پنجم میں منظور فرما لیجئے یہ دونوں سبق میں پڑھ لوں گا، مولانا نے منظور فرمالیا جب اسباق شروع ہو گئے تو مولانا نے مجھ سے ان دونوں اسباق کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے درخواست کی کہ آپ ہی وقت نکال کر پڑھا دیں یا کسی اور کو بتا دیں، میں اس سے پڑھ لوں گا، فرمایا کہ میرے پاس تو کتابیں زیادہ ہیں وقت نہیں ملے گا اور دوسرے اساتذہ کا حال بھی یہی ہے، پھر آپ کا نام لیکر فرمایا کہ ہے تو وہ طالب علم اور نیچے درجہ کا ہے مگر وہ اچھی طرح پڑھا لے گا، اگر تم منظور کرو تو اس سے پڑھ لو، میں اس لئے آیا ہوں، مجھے مولانا کی شفقت وعظمت کا احساس ہوا۔

پھر میرے پاس یہ دونوں سبق شروع ہو گئے، میں مولانا کے پاس پڑھتا تھا اور یہ بزرگ طالب علم مجھ سے پڑھتے تھے، سال کے آخر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

یہ بات مولانا کو بھی یاد تھی، میں نے اس واقعہ کو اپنی آپ بیتی؛ حکایت ہستی؛ میں لکھا تو مولانا نے اس کی تصدیق فرمائی، بلکہ مرض وفات میں ممبئی جب تشریف لائے تھے اور میں بھی مجلس میں حاضر تھا تو حاضرین سے فرمایا کہ جب یہ طالب علم تھے اور طلبہ کو تکرار کراتے تھے تو میں سنا کرتا تھا، یہ مجھ سے اچھا سمجھاتے تھے، یہ بات میں نے حضرت کی زبان سے پہلی مرتبہ سنی تھی، اس ارشاد سے مجھے ان طالب علم کا واقعہ یاد آیا اور دل پر مولانا کی عظمت کا نور پھیل گیا۔

تعلیم کا یہ سال میرے لئے بڑی محنت اور عربی زبان وانشاء کی جد وجہد کا سال تھا، ماحول نہ ہونے کے باوجود میں عربی لکھنے اور بولنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا، اس موضوع پر مولانا سے مجھے

بہت مدد ملی، میری عربی تحریریں اور عربی ترجمے مولانا کی نگاہ سے گزرتے تھے، مولانا اصلاح فرماتے، مشورے دیتے، حوصلہ افزائی فرماتے، مولانا میری محنت دیکھتے اور بڑی قدر کرتے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مولانا کس قدر نگاہ رکھتے ہیں، ایک روز میں عصر کی نماز کے بعد کمرہ میں تنہا بیٹھا کسی کتاب میں غرق تھا، کھڑکی کے پاس میں بیٹھا تھا، باہر عام راستہ تھا، ادھر سے مولانا گزرے، سامنے کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور سلام کیا میں گھبرا گیا، بڑی شفقت سے فرمایا عصر کے بعد ذرا تفریح کر لیا کرو، ہمہ وقت کتابوں میں غرق رہتے ہو صحت کا خیال رکھو، میں نے آہستہ سے عرض کیا کہ میرا جی کتابوں کے علاوہ اور کسی چیز میں لگتا ہی نہیں، مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔

اس سال کتابوں میں میرے نمبرات بہت اچھے آئے جس کی وجہ سے اساتذہ کی توجہات کا میں مورد بن گیا، مولانا تو شروع سال ہی سے متوجہ تھے، اگلا سال آیا تو ہدایہ ثانی اور سلم العلوم اور اس کے بعد ملاحسن کے اسباق مولانا کے پاس آئے مولانا بڑی توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے! بالخصوص سلم العلوم کا سبق بہت اچھا ہوتا، مولانا فن منطق پر خوب حاوی تھے، سلم کے بعد ملاحسن کا درس شروع ہوا تو مولانا کے جوہر اور کھلے، اس کتاب میں مولانا کی ذہانت خوب کھلتی تھی، مولانا کا حافظہ بہت اچھا تھا، موضوع کے اعتبار سے یہ درس خشک تھا، مگر مولانا موقع بموقع بعض دلچسپ اشعار بھی سنایا کرتے جس سے مطلب سمجھنے میں مدد ملتی، مولانا کو اشعار بہت یاد تھے، بالخصوص عربی کے اشعار بہت کثرت سے یاد تھے، مقامات کے سبق میں اس کا ظہور ہوا کرتا تھا، ہم لوگوں کے درمیان یہ بات معروف تھی کہ جو شعر مولانا ایک بار سبق میں پڑھ دیتے ہیں پھر سال بھر وہ شعر زبان پر نہ آتا، ہر روز نئے نئے اشعار سناتے، اس سے اندازہ ہوتا کہ مولانا کا ذہن کس قدر قوی ہے۔

اس سال طلبہ کی طرف سے مولانا کو کچھ ناگواریاں پیش آئیں، مولانا ناراض ہوئے، مولانا کا دل ٹوٹا، مگر مولانا بڑے اصحاب عزیمت میں سے تھے، اسباق علی حالہ چلتے رہے، جن طلبہ سے ناگواریاں ہوئی تھیں ان میں سے اکثر نے معافی مانگ لی، مولانا نے معاف کر دیا۔

ایک سال بعد مولانا تبلیغی جماعت کے چلے میں نکل گئے، مولانا کو جماعت کے مشغلے سے بہت دلچسپی تھی، چلے میں مولانا نے سال بھر تبلیغی دورے میں گزارا، اس سے فارغ ہوئے تو مدرسہ الاصلاح سرائمیر میں تدریس کی خدمت اختیار کی، پھر گجرات، بنارس، حیدرآباد میں آپ کا فیضان جاری رہا، میں بنارس، غازی پور، الہ باد میں رہا، کافی عرصہ تک مولانا سے ملاقات کم رہی۔

مولانا جب مظہر العلوم بنارس تشریف لے گئے اور میں غازی پور میں تھا تو ملاقاتوں کی تجدید ہوئی، میرے بوڑھے دوست حاجی عبدالاحد صاحب جو خود پورہ معروف کے رہنے والے ہیں اور مولانا سے بہت محبت رکھتے ہیں انھوں نے از سرنو مجھے مولانا کی خدمت میں پہونچایا، یہاں سے روابط وتعلقات کے استحکام کا ایک نیا باب کھلا، پھر مولانا سے قرب بڑھا اور بڑھتا چلا گیا، مولانا کی توجہات، مہربانیاں اس درجہ بڑھیں کہ میں شرمندہ ہو ہو کر رہتا۔

مجھے یاد ہے کہ مولانا بنارس میں تھے اور یہ خاکسار شیخو پور آچکا تھا، بنارس ضلع میں ایک جگہ ہے گوگہرا، وہاں جلسہ تھا، جاڑے کا موسم تھا، مجھے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا تھا، حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب مدظلہ کا بھی پروگرام تھا، میں بنارس آیا اور مفتی صاحب کے قافلہ میں شریک ہوکر گوگہرا کے لئے نکلا، مغل سرائے اسٹیشن کی مسجد میں ہم لوگ نماز کے لئے اترے، نماز سے فارغ ہوکر میں نے دیکھا کہ مولانا عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں، میں نے توقف کیا مولانا فارغ ہوئے تو میں نے ملاقات کی، خیریت پوچھی تو بتایا کہ میں بھی گوگہرا چل رہا ہوں، میں نے عرض کیا آپ بھی مدعو ہیں، فرمایا مدعو نہیں ہوں ، اشتہار میں تمہارا نام دیکھا تو میں نے سوچا کہ تمہاری تقریر سنے ہوئے بہت دن ہوئے، چل کر تمہاری تقریر سن لوں میں حیرت زدہ ہوا اور شرمندہ بھی! مگر مولانا تاکید یہی فرماتے رہے، مولانا تشریف لے گئے، جلسہ میں شریک ہوئے، میری تقریر اول سے آخر تک سنی اور دعا دیتے رہے۔

جاڑے کی لمبی رات تھی ایک ڈیڑھ بجے جلسہ ختم ہوا، ختم کے بعد زمانیہ کے مولانا محمد ازہر سلمہ میرے پاس آئے اور کہا کہ زمانیہ چلئے، میں نے کہا میرے ساتھ میرے استاذ بھی ہیں، میں انھیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا، مولوی ازہر نے کہا میں حضرت سے بھی درخواست کرتا ہوں، چنانچہ انھوں نے درخواست کی اور مولانا نے بڑی بشاشت سے ان کی درخواست قبول کی، سواری کے لئے جیپ تھی ہم دونوں آگے کی سیٹ پر بیٹھے، سردی شباب پر تھی، گاڑی جب چلی ہے تو مولانا نے فرمایا کہ میں ایک اور خاص مقصد سے یہاں آیا ہوں، وہ یہ کہ ایک ہفتہ سے میرے قلب پر ایک دباؤ سا محسوس ہو رہا ہے اور وہ دباؤ یہ ہے کہ آپ اس وقت کسی پریشانی اور دقت میں ہیں، میرے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ پریشانی معلوم کروں، میں حیرت میں پڑ گیا میں نے عرض کیا کہ ایسی کوئی پریشانی مجھے نہیں ہے، مولانا نے فرمایا نہیں کچھ تو ہے کہ میں اپنے قلب پر مسلسل محسوس کر رہا ہوں، سوچ کر بتایئے، میں نے عرض کیا پریشانی سوچنے کی مہلت تو دیتی نہیں وہ تو خود اپنے زور سے دباتی رہتی ہے، مولانا نے اصرار فرمایا کہ کوئی

بات ضرور ہے، تب مجھے خیال آیا کہ یہ لمبا سلسلہ ہے، حق تعالی کا میرے دل پر احسان ہے کہ دنیاوی ضرورتوں کا دباؤ مجھ پر کم ہوتا ہے، اللہ نے مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا ہے مگر میرے پاس رہائش کے لئے کوئی مکان کبھی نہیں رہا، جس مدرسہ میں پڑھایا وہاں کے لوگوں نے میری رہائش کا انتظام کیا، اپنے گاؤں میں تعطیلات میں آیا تو کسی رشتہ دار کے خالی مکان میں رہ لیا، کچھ وقت والد کے مکان میں گزار لیا ،اس کی وجہ سے کبھی کبھی تنگی پیش آتی تھی، مگر میری لا ابالی طبیعت اسے نظر انداز کر دیتی تھی، اس طرح بیس بائیس سال کی مدت گزر گئی، بچے بھی بڑے ہو گئے، میرے بعض خاص احباب کو فکر ہوئی کہ ایک مکان میرے لئے ہو جانا چاہئے، گاؤں میں ایک مکان بک رہا تھا میرے دوستوں نے اسی ہزار روپئے میں اسے طے کر لیا، میرے پاس اسی سو روپئے بھی نہ تھے جو ہمت کرتا، والد نے حوصلہ کیا اور آدھی رقم دینے کا وعدہ کر لیا بلکہ دے بھی دیا، بقیہ آدھی رقم کا انتظام بھاری پڑ رہا تھا، میں نے معذرت کر لی کہ میرے پاس نہ رقم ہے اور نہ اس کا بوجھ اٹھاؤں گا، جس طرح گزر رہی ہے گزر جائے گی چندروز کی زندگی ہے، مگر میرے دوستوں کو بہت فکر تھی، وہ مسلسل سوچ رہے تھے مگر کوئی تدبیر بن نہ پا رہی تھی۔

یہی وہ دور تھا، میں نے مولانا سے صورت حال بتائی کہ یہی پریشانی ہوسکتی ہے کہ اگر یہ سودا ہاتھ سے نکل گیا تو جن لوگوں نے اس سلسلہ میں محنت کی ہے ان کی محنت بیکار ہو جائے گی۔

مولانا نے فرمایا ہاں یہی بات معلوم ہوتی ہے، اچھا میں ایک دعا بتاتا ہوں، اسے پڑھئے اور اپنے دوستوں کو بتایئے کہ وہ بھی اسے بکثرت اہتمام سے پڑھیں، وہ دعا یہ ہے:

اللهم رب السموات السبع ورب العرش العظيم اللهم اكفني كل مهم من حيث شئت و من اين شئت حسبي الله لديني حسبي الله لما اهمني حسبي الله لمن بغى عليَّ حسبي الله لمن حسدني حسبي الله لمن كادني بسوء حسبي الله لا اله الا هو عليه توكلت وهو رب العرش العظيم.

یہ دعا مجھ کو یاد تھی ، میں نے مولانا کو سنا دیا بہت خوش ہوئے اور فرمایا اسے پڑھئے اور پڑھوایئے، ان شاء اللہ بہت آسانی سے معاملہ ہو جائے گا۔

اس مسئلہ میں منشی عبدالسمیع صاحب، حافظ نورالہدی صاحب اور میرے چچازاد بھائی حاجی محمد بلال صاحب کو خصوصی دلچسپی تھی، میں نے تینوں کو یہ دعا مولانا کے حوالہ سے بتا دی، میں بھی پڑھتا رہا وہ حضرات بھی پڑھتے رہے اور پھر میں نہیں جانتا کہ اللہ نے کس طرح آسانیاں پیدا فرمائیں اور

چند دنوں میں ایک صاحب نے مدرسہ میں آکر مجھے اطلاع دی کی آج وہ مکان آپ کے نام رجسٹری ہوگیا، میں سجدۂ شکر بجالایا اور مولانا کی محبت وشفقت کا نقش لازوال دل پر گہرا ہوگیا۔

اس واقعہ کے بعد مولانا کے کرم کی بارش مسلسل مجھ پر ہوتی رہی، میری حاضری بھی مولانا کی خدمت میں بڑھ گئی، جامعہ مظہر العلوم بنارس میں بارہا ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، اس وقت مولانا خود ایک سخت آزمائش میں تھے، اہلیہ مکرمہ بیمار تھیں، بیماری سخت تھی اور پریشان کن، بچے چھوٹے چھوٹے تھے ان کی دیکھ ریکھ، ان کے کھانے پینے کا اہتمام، ان کے کپڑے دھونا، ان کو نہلانا دھلانا، خود اہلیہ کی پوری خدمت کرنا، اس کے بعد مدرسہ اور اسباق کی ذمہ داریاں، تن تنہا مولانا سب پوری کرتے تھے، مالی تنگی بھی تھی مگر انھیں اللہ پر جو توکل تھا اور دعا وگریہ وزاری کی جو توفیق ملی تھی اس نے ہر مرحلہ آسان کردیا زبان کیا کبھی قلب بھی حرف شکایت سے آلودہ نہ ہوا، استقامت اور پامردی سے سنگین حالات سے گزرتے رہے اور بندۂ صابر وشاکر بنے رہے، ایک طویل آزمائش کے بعد اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا، زندگی کی ایک سنگین مشغولیت سے رہائی ملی۔

مولانا نے دو نکاح کئے تھے، پہلی اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کیا، دوسرے حرم کے بعد جب عمر ڈھل چکی تھی تو آپ نے تیسرا نکاح کیا، یہ نکاح ہزار راحتوں کا سامان بنا، پچھلی تمام مشقتوں کا مداوا اس نکاح سے ہوا، زندگی کا آخری حصہ اس لحاظ سے بہت خوشگوار گزرا، خانگی اعتبار سے بھی، مالی خوش حالی کے اعتبار سے بھی، علمی خدمت گزاری کے اعتبار سے بھی، روحانی فیضان کے اعتبار سے بھی!

یہاں مجھے ایک دعا یاد آرہی ہے جسے الحزب الاعظم میں حضرت ملا علی قاری نے نقل کیا ہے، الحزب الاعظم مولانا کے معمولات میں شامل تھی، انھوں نے یہ دعا کس دل سے کی تھی، یقیناً اللہ نے اسے حسن قبول سے نوازا تھا، دعا قدرے طویل ہے مگر نقل کرتا ہوں، کیوں کہ مولانا کو دعاؤں کا بالخصوص مسنون دعاؤں کا بہت ذوق تھا۔

اللهم اجعل اوسع رزقی علی عند کبر سنی وانقطاع عمری یا من لا تراه العیون ولا تخالطه الظنون و لا یصفه الواصفون و لاتغیره الحوادث ولا یخشی الدوائر یعلم مثاقیل الجبال و مکائیل البحارو عدد قطرالامطار وعدد ورق الاشجار وعدد ما اظلم علیه اللیل فاشرق علیه النهار ولا تواری منه سماء سماء ولا ارض ارضاً ولا بحر ما فی قعره ولا جبل ما فی وعره اجعل خیر عمر ی آخره وخیر عملی

خواتمه وخير أيامي يوم ألقاك فيه يا ولي الاسلام واهله ثبتني به حتى ألقاك.

ترجمہ: اے اللہ میرا سب سے فراغت کا رزق میرے بڑھاپے میں اور میری آخری عمر میں مقدر فرما، اے وہ ذات جس کو آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں، اور جس کو خیالات نہیں پا سکتے، اور نہ بیان کرنے والے اس کی حمد وثنا بیان کر سکتے اور نہ زمانے کے حوادث اس میں اثر کر سکتے، نہ اسے گردش زمانہ کا کوئی خوف ہے، پہاڑوں کے وزن، دریاؤں کے پیمانے، بارشوں کے قطرے اور درختوں کے پتے سب اس کے علم میں ہیں، اسے وہ تمام چیزیں معلوم ہیں جن پر رات کی تاریکی چھاتی ہے اور دن روشنی ڈالتا ہے، اس سے ایک آسمان دوسرے آسمان کو چھپا نہیں سکتا اور نہ ایک زمین دوسری زمین کو اور نہ سمندر اس چیز کو چھپا سکتا ہے جو اس کی تہ میں ہے اور نہ پہاڑ جو اس کے پتھریلے جگر میں ہے، میری عمر کا بہترین حصہ آخر عمر کو اور میرا سب سے اچھا عمل خاتمے کے وقت مقدر فرما، اور میرے دنوں میں سب سے بھلا دن وہ بنا جس میں تجھ سے ملوں، اے اسلام اور اہل اسلام کے مالک، مجھے آپ کی ملاقات تک اسلام پر ثابت قدم رکھئے۔

اللہ جانے کس دل سے مولانا نے یہ دعا کی ہوگی کہ اس کا ہر ہر جزء آپ کے حق میں قبول نظر آتا ہے حق تعالی کا بڑا انعام ہے بڑا کرم ہے، ان شاء اللہ وہ دن سب سے بھلا ہوگا جب پروردگار سے ملاقات ہوگی یعنی قیامت کا دن۔

جامعہ مظہر العلوم بنارس سے رٹائر ہونے کے بعد مولانا کچھ دنوں دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد میں تشریف فرما رہے، اس کے بانی ومہتمم مولانا محمد رضوان قاسمی علیہ الرحمہ باصرار انھیں لے گئے تھے، وہاں وہ تخصص کے درجات کے مشرف تھے، اس کے کچھ دنوں بعد جامعہ مظاہر علوم سہارن پور میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ کھولا گیا، اس کی نگرانی اور صدارت کے لئے اہل انتظام کی نگاہیں مولانا پر پڑیں، حیدر آباد سے ہٹنے کا موقع نہیں تھا مگر جامعہ مظاہر علوم کی مرکزی حیثیت، بزرگوں سے اس کا قدیم انتساب متقاضی تھا کہ اس کی ضرورت کو ترجیح دیا جائے، چنانچہ اکابر بزرگوں کے مشورہ اور حکم سے مولانا یہاں تشریف لائے اور درس حدیث کی بساط از سر نو بچھائی، درجہ تخصص سے بہت باکمال فضلاء تیار ہوئے، حدیث وفن حدیث کی کتابیں مولانا کی نگرانی میں از سر نو زیور تحقیق وتعلیق سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں۔

سہارن پور حضرت کے قیام کے دوران میری بار ہا حاضری ہوئی اور حضرت کے کرم فراواں سے نہال ہوتا رہا۔ بقیہ صفحہ ۲۶ پر

تاج محل آگرہ

از: جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی

[پیش نظر مضمون ماہنامہ ''برہان'' جون ۱۹۵۴ء=شوال ۱۳۷۳ھ کے شمارے میں شائع ہوا تھا یہ مضمون راقم کی نظر سے گزرا تو اس کو پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ اگر چہ برسوں پہلے کا سپرد قلم کیا ہوا ہے، لیکن دلچسپ اور معلومات افزا ہے، اس لیے قند مکرر کے طور پر ''المآثر'' میں بھی اس کو ایک دفعہ شائع کر دیا جائے ادارہ]

حال ہی میں ہندوستان گورنمنٹ نے پبلک کی اطلاع کے لیے یہ نشر کیا ہے کہ کئی سالوں کی لگا تار کوشش کے بعد تاج محل آگرہ کی مرمت مکمل ہوگئی ہے اور اب اس میں کسی قسم کا نقص وغیرہ نہیں رہا اور عنقریب گورنمنٹ اس کی تین سو سالہ برسی منائے گی، یہ خبر بہت مسرت کا باعث ہے پاکستان بننے سے پیشتر میرے پونہ میں قیام کے زمانے میں ہندوستان کی گورنمنٹ کی سنٹرل پی ڈبلیوڈی کے محکمہ کے انجینئر اعلی جناب خاں بہادر محمد سلیمان صاحب نے راقم کی مطبوعہ فرنچ زبان کی کتاب ''تاج'' کو طلب کیا تھا اور چند امور استفسار کئے، میں نے آپ کے جواب میں فوراً جو میری ذاتی معلومات تھیں بہم پہنچائیں اور کتاب مطلوبہ بھی ارسال کر دی تھی، اسی طرح پونہ کے انجینئرنگ کالج کے اسٹاف میں سے ماہرین مسٹر گُپ چُپ، مسٹر گوشی وغیرہ جب خان بہادر محمد دین انجینئر کے ایماء پر آگرہ جانے لگے تب بھی انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا تھا، واضح رہے کہ تاج کے گنبد میں جو نقص بیان کیا جاتا تھا اس کا حوالہ اورنگ زیب کے خط کتابت میں بھی ملتا ہے جو اس نے اپنے والد شاہ جہاں کو اس کی زیارت کرنے کے بعد لکھا ہے جب کہ تاج اس سے تھوڑا عرصہ پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔

میں نے تاج محل آگرہ کو ثقافت اسلامی کا بہت بڑا شاہکار تصور کرتے ہوئے اس پر جو تحقیقی مقالہ لکھا وہ بصورت مبسوط مصور کتاب ہرسل (بلجیم) فرنچ زبان میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہو چکا ہے، جس میں قریب دو سو صفحات اور قریب ایک سو ضروری تصاویر بھی ہیں، چونکہ آج یہاں طباعت کی بے شمار دقتیں

ہیں اس لیے اب تک اسے اردو یا انگریزی زبان میں پیش نہیں کرسکا حالانکہ ہر دو بالکل تیار ہیں۔ احباب کا شکر گذار ہوں کہ ان کا تقاضا برابر جاری ہے توقع ہے کہ عنقریب شائع ہو جائیں گی، بہر حال میں ذیل میں چند سطور بطور تمہید تاج کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر اپنی تحقیقات کا لُبِّ لباب پیش کرتا ہوں۔

تاج ۱۰۴۰ھ سے شروع ہوکر ۱۰۵۷ھ میں اختتام کو پہنچا یعنی کچھ سال اوپر تین سو سال آج تعمیر تاج کو گذر چکے ہیں، اس لیے میں بھی ہندوستان کے جشن تین سو سالہ میں اس مختصر مقالۂ ذیل بعنوان ''تاج محل آگرہ'' ہدیہ ناظرین کرنا فرض سمجھتا ہوں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاج محل آگرہ اپنی بے مثال تعمیری خوبیوں کی وجہ سے عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے اور انھیں خوبیوں کی بنا پر بہت سی غلط فہمیاں بھی اس کے متعلق پیدا ہوگئی ہیں، افسوس اس امر کا ہے کہ صحیح تحقیق سے کام نہیں لیا گیا اور اصل ماٰخذ سے روگردانی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے لفظ تاج کے متعلق عرض ہے کہ یہ دراصل لفظ ممتاز کی بگڑی شکل ہے، جس کا آغاز زیادہ تر گذشتہ صدی سے ہوتا ہے ورنہ اسے روضہ ممتاز محل کہنا بجا ہوگا، ارجمند بانو بیگم جس کا خطاب ممتاز محل تھا، شاہجہاں بادشاہ کی چہیتی بیوی تھی جو نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی بیٹی تھی۔ اس کا انتقال ۱۰۴۰ھ میں بمقام برہان پور ہوا اور اس کی نعش کو آگرہ میں لایا گیا جہاں اس کے روضہ کی تعمیر جمنا ندی کے کنارے ۱۰۴۰ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰۵۷ھ میں مکمل ہوئی۔

ہندوستان میں فن تعمیر خاص کر شاہجہاں کے زمانہ میں ہر اعتبار سے اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا تھا، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خود بادشاہ مذکور کو بچپنے سے تعمیر کا بڑا شوق تھا، فن تعمیر اس کے لیے طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ جہانگیر نے خود اپنی اکثر عمارات شہزادہ خرم (بعد میں شاہجہاں) کے زیر اہتمام تعمیر کرائیں جیسا کہ باغ شالامار کشمیر وغیرہ۔ مورخین نے جہاں شاہجہاں کے اوقات کاروبار روزمرہ کی تقسیم کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے عمارات کے نقشے تیار کرانے اور ان میں اس کی گہری دلچسپی کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے ان میں ترمیم اور اصلاح کرتا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعض عمارات کو اپنی مرضی یا نقشہ کے خلاف تعمیر ہوتا دیکھ کر گروادیا اور از سر نو نقشہ اور ہدایت کے مطابق تعمیر کرایا جس سے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ خود بڑا ماہر عمارات تھا۔

قدسی شاعر دربار شاہجہاں لکھتا ہے۔

عمارات را جملہ برداشتند منازل در آنجا برافراشتند
ہمہ طرحہا زادۂ طبع شاہ پژدہ بآں ہوش راہ
حکیم مہندس شہنشاہ دہر دقیقہ رس دور سرش بہر

بادشاہ نامہ میں شاہجہانی عمارات کی تعمیر کا ذکر بالتفصیل ملتا ہے، مگر تاج محل کے تعلق میں یہ بیان کہیں نہیں ملتا کہ اس کا معمار کون تھا، ہاں یہ درست ہے کہ ۱۰۵۳ھ کے بیان میں مورخین نے اس روضہ کی مستقل تفصیل دی ہے جو آج بھی درست بیٹھتی ہے، اس بیان میں دو نام میر عبدالکریم اور مکرمت خاں ملتے ہیں جن کے زیر اہتمام یہ روضہ تعمیر ہوا ادھر تاج کے گنبد کے اندر امانت خاں شیرازی کا نام ملتا ہے جس نے خط نسخ میں کتبات جو آیات قرآنی پر مشتمل ہیں اسی نے لکھے ہیں جیسا کہ الفاظِ عبارت سے بھی واضح ہے۔

بادشاہ نامہ میں مذکور ہے کہ جب ۱۰۴۸ھ میں دہلی میں شاہجہاں نے لال قلعہ اور نئے شہر شاہجہاں آباد کی بنا رکھی، ان کی تعمیر کا کام احمد اور حامد دو معماروں کے حوالے غیرت خان کی زیرنگرانی کیا جو اس زمانہ میں اپنے فن میں یکتا تھے اور ان عمارات کا بھی میر عمارت مکرمت خاں شیرازی تھا، اس لیے ہمیں اس موقع پر واضح کر دینا چاہئے کہ اگر ان دو معماروں احمد وحامد کا تعلق تاج کی تعمیر سے بھی تھا تو بادشاہ نامہ میں بالضرور تاج کے بیان میں ان کا بھی ذکر ملتا، ہر دو بادشاہ نامہ اور عمل صالح شاہجہاں کے عہد کی مستند تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا اگر چہ احمد معمار کے فرزند لطف اللہ مہندس نے اپنے اشعار میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ روضہ ممتاز محل میرے باپ نے تعمیر کیا تھا مگر اس کی تصدیق کسی اور شہادت سے نہیں ہوتی۔

ایک مغربی سیاح پادری منیرق ہندوستان میں تاج کی تعمیر کے وقت سیاحت کر رہا تھا، اس نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ مجھ سے پادری ڈی کا سٹرو نے قیام لاہور کے زمانہ میں بیان کیا کہ روضہ ممتاز محل کا معمار ایک اطالوی وینس کا باشندہ جیرونیو دیرونیو تھا، اس کی تصدیق کسی دیگر تاریخی شہادت وغیرہ سے نہیں ہوتی، یہ ضرور ملتا ہے کہ یہی جیرونیو دیرونیو ہگلی کلکتہ کی لڑائی میں شاہ جہاں کے خلاف پرتگالیوں کا مددگار تھا، بعض اسے جوہری بھی کہتے ہیں مگر اس کے معمار ہونے کے متعلق کہیں کوئی روایت نہیں ملتی، بے شک اس کی قبر آگرہ میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک اور فرانسیسی موسیو آسٹن

ڈی بورڈو کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تاج تعمیر کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص ہندوستان میں جہانگیر کے زمانہ میں شاہی ملازمت میں تھا اور توزک جہانگیری میں موجود ہے کہ اس کو اپنی کارکردگی کی وجہ سے ہنرمند کا لقب بھی دیا گیا تھا، جب شاہجہاں کا زمانہ آیا تو دربار سے اس کے تعلقات بدستور قائم رہے بلکہ بادشاہ نے ایک مرتبہ سفارت پر پرتگالیوں کے پاس بھی بھیجا تھا مگر انھوں نے اسے ہلاک کرڈالا اور یہ واقعہ ممتاز محل کی وفات سے قبل وقوع میں آتا ہے، اس لیے محال ہے کہ تاج کی تعمیر سے اس کا تعلق رہا ہو، جب تاج زیر تعمیر تھا اتفاق سے بہت سے یورپین سیاح ہندوستان میں موجود تھے، جن میں دو سیاح بر یز اور ٹیور یز فرانسیسی قابل ذکر ہیں ان کے سفرنامے بھی طبع ہو چکے ہیں اور دونوں اس کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کامل طور پر مشرقی عمارت ہے جس کی نظیر یورپ میں بھی نہیں اگر کوئی یورپین ماہر تاج کی تعمیر پر مقرر ہوتا تو یہ لوگ ضرور ذکر کرتے۔

گذشتہ صدی سے ہمارے سامنے ایک استاذ عیسی کا نام پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے تاج تعمیر کیا اور نقشہ بنایا، اس کا نام دراصل ایک گائڈ میں ملتا ہے جو آگرہ کالج کے طلبہ نے ۲۶-۱۸۲۵ء میں تیار کی تھی اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، ایک شخص مانک چند نامی اس کا مصنف ہے جو آگرہ کالج کا ایک طالب علم تھا اور اس کے بے شمار قلمی نسخے قریب قریب ہر لائبریری میں موجود ہیں، راقم کے پاس بھی چھ سات ہیں، برٹش میوزیم کے نسخہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ آگرہ کے مجسٹریٹ مسٹر لشنگٹن کے ایک اشتہار کے جواب میں تالیف ہوا تھا جس کے مخاطب طلباء آگرہ کالج تھے مگر اس کو عہد شاہ جہانی سے کوئی تعلق نہیں، اس میں کاریگروں کی فہرست میں ایک استاذ عیسی کا نام بھی ملتا ہے، نہ معلوم اس کی ابتدا کیسے ہوئی، یہ نسخہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر نا قابل اعتبار ہے، یورپین مصنفین نے اس استاذ عیسیٰ نام کا اس رسالہ کو ترجمہ کرتے وقت ایک ''کرسچین'' لکھا ہے، مجھے ایک نسخہ متعلقہ تاج پیرس کے کتب خانہ ملی میں ملا جس میں روضہ کی پیمائش اور مصارف درج ہیں، یہ نسخہ قدیم اور صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے میں نے اسے الگ شائع کر دیا ہے، اس کی تاریخ کتابت اخیر میں ماہ ربیع الاول ۱۱۸۸ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ دراصل تمام روضہ ممتاز محل کی تفصیلی یادداشت ہے جو بعد تیاری روضہ کے تیار کی گئی ہے اور یہی اس سے واضح بھی ہے۔

ان تمام حالات کے بیان کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تاج محل کس نے تعمیر کیا

اوراس کا نقشہ کس نے بنایا، میں اپنی تحقیقات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا معمار شاہجہاں بذات خود ہے جو اپنی بیوی کا روضہ اپنی مرضی کے مطابق تیار کرا سکتا تھا، جب کہ وہ خود بہت بڑا ماہر تعمیر تھا جیسا کہ تاریخ عہد میں ملتا ہے۔

تاج کے نقش ونگار کی طرز پرچیں کاری پر بھی حملہ کیا جاتا ہے کہ یہ اطالوی الاصل ہے جو سراسر غلط ہے، واضح رہے کہ مسلمانوں نے اپنی عمارت کو ابتدا سے ہی نقش ونگار سے مزین کیا ہے بالخصوص اس قسم کے نقش ونگار جو پتھر کی سطح پر کھود کر رنگین پتھر کاٹ کر بھر دیئے جائیں، ہندوستان میں سب سے اول اس قسم کے نقش ونگار احمد آباد کی جامع مسجد مانک چوک کے محراب میں ملتے ہیں جو ۸۱۷ھ میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے بعد یہیں سلطان ہوشنگ غوری کا روضہ (۸۳۵ھ) مانڈو ہے۔ جسے سر جان مارشل نے بھی تاج کی پرچیں کاری کو خالص مسلمانوں کا فن ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہے، غرض کہ یورپ میں یہ طرز فن بنام پیترا ڈورا سولہویں صدی عیسوی یعنی بہت بعد کی رائج شدہ ہے۔

تاج محل میں جو چیز زیادہ دل کش ہے وہ اس کی ہمہ گیر موزونیت اور منظّم پن ہے جو زیادہ اس کے امرودی گنبد نے پیدا کی ہے جس کی مثال دنیا بھر کے عمارات میں نہیں ہے، پھر اندرون تعمیر میں یہ گنبد دہرا ہے یعنی اس بیرونی گنبد کے اندر ایک اور گنبد ہے، اسی عمارت تاج میں زیر زمین سردانہ ہے جو قبر ممتاز الزمانی کا صحیح مقام ہے اگر ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ہر دو امور (دہرا بلب نما گنبد اور زیر زمین سردانہ برائے قبر جو مغلوں نے اپنی شہزادیوں کی قبور کے لیے مخصوص کر دیا تھا سمرقند سے روضۂ تیمور جسے گور امیر کہتے ہیں آئے ہیں) کے نقش قدم پر ہی یہ گور امیر دراصل تیمور نے خود اپنی زوجہ بی بی خانم کے لیے اول تعمیر کیا تھا جس میں وہ بعد میں خود دفن ہوا۔

غرض کہ تاج محل اپنی تمام تعمیری اور فنی خوبیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں عجائباتِ روزگار میں شمار ہوتا ہے اور دنیا کی عمارات میں بالکل ایک الگ درجہ رکھتا ہے اور میرے نزدیک ثقافتِ اسلامی کا مظہر بھی ہے۔ اور جس طرح اسے دنیا بھر میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے اسی طرح اس کے متعلق ان کی وجہ سے اس کے گرد کئی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا ازالہ ضرور ایک مشکل امر ہے تاہم راقم نے اپنی کتاب تاج محل میں جو عنقریب شائع ہو رہی ہے تمام امور کو بالصراحۃ بیان کرنے اور وضاحت کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ کتاب کو ضروری اور اہم تصاویر سے مصور بھی کیا ہے۔